ماہنامہ

ترجمان القرآن

جاری کردہ:

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ، اچھرہ۔ لاہور (پاکستان)

ترجمۂ قرآنِ مجید

مع مختصر حواشی

سید ابو الاعلیٰ مودودی

اس میں

مترجم نے قرآنِ حکیم کے متن اور تفہیم القرآن کے ترجمے کے ساتھ بہت مختصر حواشی درج کر دیے ہیں تاکہ عام لوگ جو قرآن مجید کا سیدھا سادہ مفہوم سمجھنا چاہتے ہیں وہ ایک ہی جلد میں تفہیم القرآن کے خلاصے سے فائدہ اٹھا سکیں۔

سائز: ۲۳×۳۶/۱۶ ○ صفحات: ۱۵۸۴ ○ کاغذ: امپورٹڈ وُڈ مکینیکل ○ [illegible] ۱۵۰/- روپے

ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ

اردو بازار، لاہور
فون نمبر: [illegible]
پوسٹ بکس نمبر: [illegible]

جلد ۱۱۸ نومبر ۱۹۹۲ء عدد ۳

ماہنامہ

ترجمان القرآن

خصوصی اشاعت

اسلامی نظامِ جماعت

جاری کردہ :

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لیمیٹڈ، اچھرہ، لاہور (پاکستان)

رجسٹرڈ نمبر ایل - ۵۳۴۰

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

جلد ۱۱۸ عدد ۳

نومبر ۱۹۹۲ء جمادی الاول ۱۴۱۳ھ

فہرست مضامین

اشارات	خرم مراد	۳
حکمتِ مودودیؒ اسلامی نظامِ جماعت		۲۲
فہمِ قرآن: تفاسیر کی روشنی میں	اخذ و ترتیب: خرم مراد	۲۹
اسلامی نظمِ جماعت	نعیم صدیقی	۵۵
طبقۂ مترفین اور اسلام کا نظامِ عدل (قسط ۵)	مولانا گوہر رحمن	۸۹
آبادی میں رد و بدل — نو آبادیاتی پالیسی (آخری قسط)	مرزا محمد الیاس	۹۶
رسائل و مسائل	ملک غلام علی	۹۹
نقد اور ادھار قیمت میں تفاوت		
مطبوعات		۱۰۲
پاسدارانِ انقلاب آئینۂ پرویزیت		

برائے ادارتی امور، منصورہ، ملتان روڈ، لاہور ۵۴۵۷۰ — فون نمبر ۸-۴۷۰۱۲۴ فیکس (۰۴۲) ۴۲۴۲۱۹

برائے انتظامی امور: رحمن مارکیٹ ۱۰ اردو بازار، لاہور ۵۴۰۰۰ فون نمبر: ۲۳۴۰۱۴ - ۲۳۶۶۶۵

پوسٹ بکس نمبر: ۱۴۴۳

قیمت خصوصی اشاعت: ۱۲ روپے ○ زرِ سالانہ: ۶۰ روپے (اندرونِ ملک)

سید حسین فاروق مودودی نے ملک عبدالحمید پرنٹرز لاہور سے چھپوا کر دفتر "ترجمان القرآن" اچھرہ، لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

خرم مراد

ماہ اکتوبر میں آنے والے پانچ سالوں ۱۹۹۴ تا ۱۹۹۸ء کے لیے جماعتِ اسلامی پاکستان کی مرکزی امارت کے انتخابات مکمل ہوگئے۔ دستورِ جماعت میں طے کردہ طریقِ کار کے مطابق' پاکستان بھر کے ۴۸۷۶ ارکان جماعت میں سے ۹۶ فیصد ارکان نے خفیہ بیلٹ کے ذریعے ان انتخابات میں اپنا ووٹ دیا۔ مجلسِ شوریٰ کے مقرر کردہ ناظمِ انتخابات کے اعلان کے مطابق' رائے دینے والے ارکان کی ایک بہت بڑی تعداد نے' یعنی ۷۷ فیصد ارکان نے' ایک دفعہ پھر' حالیہ امیر محترم قاضی حسین احمد کو امیرِ جماعت اسلامی پاکستان منتخب کرلیا ہے' اور اس طرح نظمِ جماعت اور تحریک کو چلانے کی آخری ذمہ داری کی امانت کا بارِ عظیم ان کے سپرد کردیا ہے۔ فرد اور شخصیت کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں' لیکن اصل اہمیت تو مشن' تحریک' نظمِ جماعت اور منصب کی ہے۔ اس لحاظ سے جماعت نے اس انتخاب کے ذریعے اپنی زندگی کے سب سے اہم معاملے میں' جس قدر مکمل یک سوئی کا مظاہرہ کیا ہے' وہ جماعت کے تمام وابستگان اور بہی خواہوں کے لیے بڑے اطمینان کا باعث ہوا ہے۔ خصوصاً اس لیے کہ ان انتخابات کے موقع پر جماعت کی تاریخ میں پہلی مرتبہ بیرونی مداخلتوں اور اندرونی کمزوریوں اور فتنوں نے نتائج پر اثر انداز ہونے کی پوری کوشش کی تھی۔ فرد تو کوئی بھی منتخب ہوسکتا تھا' اور فرد آتے جاتے رہیں گے' اور جماعت اپنے ہر امیر کے ساتھ بیک وقت اطاعت فی المعروف و محبت' اختلاف' تنقید اور احتساب کی روش پر بھی انشاء اللہ ہمیشہ قائم رہے گی' لیکن جس منصب کے اوپر' دستورِ جماعت نے' نظمِ جماعت اور تحریک کو چلانے کی آخری ذمہ داری ڈالی ہے' اس کے مقام' وقار' اعتماد اور اختیار کا برقرار رہنا اور رکھنا بڑا اہم اور ناگزیر تھا' اور ہمیشہ رہے گا۔ فللہ الحمد علیٰ ذالک۔

ارکانِ جماعت دستور کی رو سے اس امر کے پابند تھے کہ وہ امیرِ جماعت کے انتخاب میں

جس کے حق میں بھی رائے دیں گے' دستورِ جماعت کی دفعہ ۱۳ میں متعین کردہ اوصاف کو مدنظر رکھیں گے۔ ناظمِ انتخاب نے' جیسا کہ قواعد و ضوابط کی رو سے ان کا فرض تھا' بیلٹ پیپر جاری کرنے کے ساتھ ساتھ ہر رکن ووٹر کو ان اوصاف کو مدنظر رکھنے کی یاددہانی تحریری طور پر کردی تھی۔ اگرچہ' مرکزی مجلسِ شوریٰ نے' ارکان کی رہنمائی کے لیے' خفیہ بیلٹ کے ذریعے' تین ارکان کے نام بیلٹ پیپر پر درج کرا دیے تھے' جیسا کہ ۱۹۷۲ سے ایسا کیا جانا شروع ہوا ہے' لیکن نہ اس اندراج کی حیثیت سفارش کی تھی اور نہ یہ تین ارکان خود امیدوار تھے کہ ان کے درمیان کوئی مقابلہ ہو' بلکہ ہر رکن آزاد تھا' اور حقیقت میں یہ اس کا فرض تھا' کہ وہ دفعہ ۱۳ میں درج کردہ صفات کے مطابق جس رکنِ جماعت پر اعتماد رکھتا ہو کہ وہ امیرِ جماعت کی ذمہ داری سنبھالنے کا' یعنی نظم اور تحریک چلانے کا' سب سے زیادہ اہل ہے' اس کے حق میں اپنی رائے دے۔ اس لیے' اگرچہ لغزش اور خطا سے تو کوئی انسان مبرّا نہیں ہو سکتا' لیکن ہمیں اس بات میں شک کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ بالعموم ارکانِ جماعت نے دفعہ ۱۳ میں درج کردہ اوصاف کو مدنظر رکھتے ہوئے ہی اس انتخاب میں اپنا امیر منتخب کیا ہے۔

دفعہ ۱۳ (۱) کے مطابق' انہوں نے جس کے حق میں بھی رائے دی' ان کے علم و ضمیر کی حد تک' ان کی رائے میں نہ وہ خود امارت کا امیدوار تھا اور نہ اس سے کوئی ایسی بات ظہور میں آئی جو یہ پتہ دیتی ہو کہ وہ امارت کا خود خواہش مند ہے یا اس کے لیے کوشاں ہے۔ ہمارے ان تینوں محترم ارکان کے بارے میں' جن کے نام بیلٹ پیپر پر برائے رہنمائی درج تھے' سب ہی جانتے ہیں کہ پوری مدتِ انتخاب میں وہ اپنے اپنے فرائضِ منصبی کی انجام دہی میں لگے رہے' اور ان میں سے کسی کی طرف سے شمہ برابر بھی کوئی ایسی بات ظہور میں نہ آئی جسے خواہش یا کوشش کا نام دیا جا سکے' بلکہ جو کچھ ظہور میں آیا وہ اس کے بالکل برعکس تھا۔ نو منتخب امیرِ جماعت خود' کیوں کہ وہ امیرِ وقت بھی تھے' ساری مدت اپنے معمول کے مطابق عوام میں دعوت پھیلانے' سیلاب زدہ لوگوں کو مدد اور تسلی دینے' اور اپنے ساتھیوں کے سینوں میں حوصلے اور امید کے چراغ روشن کرنے میں مصروف رہے۔ آج کے دور میں جماعت جیسی قوت کی قیادت سے وہ لوگ' اس طرح بے نیاز ہوں جو بغیر کسی کوشش اور خرچ کے اس کے قائد منتخب ہو سکتے ہوں' تعجب خیز بھی ہے اور اطمینان بخش بھی۔ فَلِلّٰہِ الحمد علیٰ ذالک۔

دفعہ ۱۳ (۲) میں درج کردہ تمام اوصاف کسی شخص میں بھی بدرجۂ اتم یا بہ معیارِ مطلوب نہیں پائے جا سکتے' نہ منتخب شدہ امیر میں ایسا ہونا ضروری ہے۔ نہ یہ ضروری ہے کہ سارے کے

سارے اوصاف کسی ایک شخص میں جمع ہو جائیں۔ اسی طرح کسی شخص کے حق میں رائے نہ دینا' خواہ وہ مجلس شوریٰ کے تجویز کردہ تین ناموں میں سے ہو یا کوئی اور رکنِ جماعت' ہرگز اس بات کی علامت نہیں کہ رائے دہندہ کے نزدیک وہ شخص ان اوصاف سے خالی ہے' یا اسے ان اوصاف کے لحاظ سے اس پر اعتماد نہیں ہے۔ لیکن جب ارکانِ جماعت کثرتِ رائے سے اپنے میں سے کسی فرد کو امیرِ جماعت منتخب کرتے ہیں تو وہ اس بات کا اظہار ضرور کرتے ہیں کہ ان کے نزدیک منتخب کردہ امیر' دفعہ ۱۳ (۲) کے مطابق' اپنے تقویٰ' علمِ کتاب و سنت' امانت و دیانت' دینی بصیرت' تحریکِ اسلامی کے فہم' اصابتِ رائے' تدبر' قوتِ فیصلہ' راہِ خدا میں ثبات و استقامت اور نظمِ جماعت کو چلانے کی اہلیت میں' مجموعی طور پر اور نسبتاً'' سب سے زیادہ قابلِ اعتماد ہے۔ فللّٰہ الحمد علیٰ ذالک۔

ارکانِ جماعت کا یہ اعتماد ہی امیرِ جماعت کے لیے' نصرتِ الٰہی کے بعد' اس کا سب سے قیمتی سرمایہ ہے' اور یہی اس کی اور جماعت کی قوت کا اصل خزینہ ہے۔ ہر لمحہ اور ہر قسم کے حالات میں اسے اپنے اس سرمایہ اور قوت کی نگہداشت اور حفاظت کرنا چاہیے' اس کو کسی صورت ضائع نہ ہونے دینا چاہیے' اس میں مسلسل اضافہ کی کوشش میں لگا رہنا چاہیے' اور ارکان کے اس اعتماد پر پورا اترنے کے لیے بھی ہروقت کوشاں رہنا چاہیے۔ یہ اعتماد اس کا سرمایہ اور قوت ہی نہیں' اس کے لیے ایک کڑی آزمائش اور بھاری بوجھ بھی ہے۔ اس اعتماد پر پورا اترنے کے لیے' وہ وابستگانِ جماعت اور خلقِ خدا ہی کے سامنے نہیں' بلکہ خود خدا کے سامنے' دنیا اور آخرت دونوں جگہ' جواب دہ ہے۔ ارکانِ جماعت نے اپنے حسنِ ظن اور علم پر بھروسہ کرکے جن اوصاف کے بارے میں اس پر اعتماد کیا ہے کہ وہ اس میں پائے جاتے ہیں اور اسے اپنا امیر منتخب کیا ہے' ان کا ادنیٰ سا احساس بھی کافی ہے کہ اس کا دل کپکپا اٹھے اور اس کا وجود لرز اٹھے۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ امیرِ جماعت کو ان مطلوبہ اوصاف سے زیادہ سے زیادہ آراستہ کرے' اور معیارِ مطلوب کے پیمانہ سے جہاں اور جتنی کمی یا خرابی پائی جاتی ہو اسے زیادہ سے زیادہ دور کرے۔ ہماری یہ دعا بھی ہے کہ وہ انھیں ارکانِ جماعت کی اتنی بھاری اکثریت کے حسنِ ظن اور اعتماد کے مطابق بننے اور اس پر پورا اترنے کی توفیق عطا فرمائے' اور انھیں بالآخر اپنی بارگاہ میں سرخ رو کرے۔ آمین

جماعتِ اسلامی میں' امارت کے انتخابات کا معاملہ' حالیہ انتخابات سے پہلے تک' کلیتاً'' اس

کا اندرونی معاملہ رہا ہے۔ ایک مدت ختم ہوتی تھی' خاموشی سے انتخاب کا عمل حرکت میں آتا تھا' ملک کے طول و عرض سے ارکان انتخاب میں حصہ لیتے تھے' ناظمِ انتخاب نتیجہ کا اعلان کرتا تھا' اور ارکان جسے امیرِ جماعت منتخب کرتے تھے وہ نئی مدت کے لیے حلف امارت اٹھا لیتا تھا۔

حالیہ انتخاب میں صورت حال بہت مختلف رہی۔ یہ انتخاب ملک بھر میں گفتگوؤں اور اخباری سرخیوں' خبروں' کالموں اور تجزیوں کا موضوع بنا رہا۔ جماعت کے اندر ہونے والے خالص تنظیمی امور کو برسرعام بیان کیا گیا' اور کرایا گیا' اور ان کو زیرِ بحث لایا گیا۔ مشہور و معروف کالم نویسوں نے مجلسِ شوریٰ کے تجویز کردہ ناموں کو' امیدوار متصوّر کرتے ہوئے' ان کے درمیان موازنے کیے' ایک یا دوسرے کے حق میں یا خلاف رائے دی' اور ان کی فتح یا شکست کی پیشین گوئیاں کیں۔ ملک کے وزیراعظم کے دل میں بھی یہ خواہش مچلتی رہی کہ وہ جماعت کی مجلسِ شوریٰ سے براہِ راست خطاب کرکے اسے اس کے امیر کے خلاف اپنا ہم نوا بنائیں۔ ایک پڑوسی ملک کے عارضی صدر نے بھی' جو ہمیں اپنی دعوت و جہاد کی سرگرمیوں کی وجہ سے محبوب رہے ہیں اور جو ایک طویل عرصے تک ہمارے ملک ہی کے نہیں بلکہ ہمارے بھی خصوصی مہمان رہے ہیں اور جن کے اکرام' خدمت اور نصرت و مساعدت میں ہم نے اپنی حد تک کوئی کسر نہ اٹھا رکھی' یہ ضروری سمجھا کہ وہ پاکستان کے ایوانِ صدر میں بیٹھ کر یہ اعلان کریں کہ اگر جماعت نے فلاں شخص کو امیر منتخب کرلیا تو پھر ان کے ساتھ تعلق ٹھیک رہنا مشکل ہوگا۔ ایک اور اہم مسلمان ملک کے ذمہ داروں نے صاف صاف یہ بات کہی کہ جماعت کو بچانے کے لیے فلاں شخص کو ہر قیمت پر امیر منتخب ہونے سے روکنا ضروری ہے۔ کچھ خفیہ اور حسّاس اداروں کی دلچسپی کے تذکرے بھی ہوتے رہے۔ بعض یگانگت کے لبادوں میں ملبوس "خیرخواہ" بھی ہر ممکن طریقے سے اپنے کالموں میں "جماعت بچاؤ" کی مہم چلاتے رہے۔ اندر کے بعض افراد بھی اختلاف و احتساب کے آداب و حدود سے تجاوز کرگئے' یا انہوں نے خود کو ایسا کرنے پر مجبور سمجھ لیا۔

اس بات سے قطع نظر کہ ان ساری مہمّات کے باوجود ۷۷ فیصد ارکان ایک رائے پر یک سُو ہوگئے' اس صورت حال کے بعض پہلوؤں پر گفتگو کرنا ضروری محسوس ہوتا ہے۔ جماعت کے اندر اس موقع پر جو کچھ ہوا اس کا ذکر تو ہم بعد میں کریں گے' پہلے جو کچھ باہر ہوا' اس کے بارے میں چند باتیں سامنے رکھنا چاہتے ہیں۔

اتنی دلچسپی کیوں لی گئی ؟ جماعت اسلامی ایک پبلک جماعت ہے۔ وہ عام لوگوں کو مخاطب

کر رہی ہے' وہ معاشرہ کو اسلامی بنانے کی ایک تحریک ہے' وہ ایک سیاسی جماعت بھی ہے' وہ انتخابات میں بھی حصہ لیتی ہے' یہ امکان بھی ہے کہ وہ کبھی حکومت میں شریک ہو یا خود حکومت چلائے۔ اس لیے اس کے معاملات میں' اور خصوصاً اس معاملے میں کہ جماعت کو کون چلائے' پریس اور پبلک اور اندرونی و بیرونی طاقتوں کی دلچسپی بالکل فطری ہے۔

اِدھر' اس سے قبل' بانئ جماعت خود امیرِ جماعت تھے' یا ان کی مقرر کردہ شخصیت اس منصب پر فائز رہی۔ اُدھر ملک' شکست و ریخت کے بعد' مسٹر بھٹو کے بحرانی اور جمہوری آمریت کے دور سے گزرتا رہا' یا مارشل لا کا طویل دور اس پر مسلط رہا۔ اتفاق سے ' اِدھر جماعت نے ایک نیا امیر منتخب کیا' اُدھر حادثۂ بہاولپور نے مارشل لا کے دور کو فی الواقع ختم کردیا' اور ملک پانچ ہی سال کے عرصے میں دو ملک گیر انتخابات سے گزر گیا۔ ان انتخابات میں اگر جماعت "اسلامی جمہوری اتحاد" میں شریک نہ ہوتی تو ملک کا سیاسی نقشہ کچھ اور ہی ہوتا' اس بات سے انکار کی جرات وہ بھی نہیں کرسکتے جو ملک میں کھلے اور چھپے برسراقتدار ہیں۔ پھر نئے امیر نے' اپنے پیش روؤں کی چالیس سالہ محنت سے قائم کردہ بنیادوں ہی پر' اور ان کی فکر اور پالیسیوں کے تسلسل ہی میں' ملک کے کونے کونے میں جماعت کی دعوت اور کام کو پھیلانا شروع کردیا۔ انہوں نے جماعت کے دستوری طریقِ کار کے منطقی تقاضے کے طور پر اس کے اندر عوامی تحریک برپا کرنے کی صلاحیت میں بھی اضافہ کرنا شروع کردیا۔ اصولوں کو بدلے بغیر نئی نئی تدابیر بھی اختیار کیں۔ یہ کوئی ان ہی کا کارنامہ نہیں تھا' لیکن بہرحال یہ حقیقت ہے کہ ۱۹۸۹ میں جماعت کے کل پاکستان اجتماع میں تقریباً ۷۰ ہزار افراد شریک ہوئے' جبکہ ۱۹۶۳ میں یہ تعداد تقریباً ۷ ہزار تھی۔

دوسری طرف' ان پانچ سالوں میں' بین الاقوامی سطح پر بھی انقلابی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ جہادِ افغانستان نے روس کی سپرپاور کو پسپائی پر مجبور کردیا' وہ شکست و ریخت کا شکار ہوگیا' اور کمیونزم اور کمیونسٹ پارٹی بھی بظاہر ختم ہوگئی۔ جس جس پر بھی روشن' باطنِ ایام تھا وہ جان گیا کہ "فتنہ فردا' مزدکیت نہیں' اسلام ہے"۔ دنیا کی امام مغربی تہذیب نے یہ سمجھ لیا کہ مستقبل کا حریف' یعنی امامتِ عالم کا امیدوار' اسلام اور امتِ مسلمہ ہے' اور اس امکان کو حقیقت بنانے کا اندیشہ اگر کسی سے ہے تو وہ جماعتِ اسلامی کی طرح کی "بنیاد پرست" اسلامی تحریکات سے ہے۔ قوت' استعداد اور صلاحیت کے لحاظ سے ابھی بہت کمزور اور کم مایہ سہی' لیکن "گریہ کشتن روزِ اول" کی افادیت اپنی جگہ۔

اس مرتبہ پریس اور پبلک نے' اور اندرونی و بیرونی طاقتوں نے امیرِ جماعت کے انتخاب میں

اگر پہلی بار وہ دلچسپی لی جو ویسے بھی فطری تھی، اور غیر معمولی طور پر لی، تو اس کی بڑی وجہ وہ حالات ہیں جو ہم نے اوپر بیان کیے ہیں۔ یہ دلچسپی فطری ہی نہیں، بلکہ بالکل بجا ہے۔ یہ دلچسپی آئندہ بھی لی جاتی رہے گی، اور اگر جماعت خود ہی اپنا مقام نہ کھو بیٹھے تو بڑھتی ہی جائے گی۔ جماعت کو اس پر نہ تعجب ہونا چاہیے، نہ اعتراض، نہ تشویش؛ ہاں، اس کو یہ مطالبہ کرنے کا پورا حق ہے کہ اس دلچسپی میں، اگر کسی کو گرانا یا اٹھانا بھی مقصود ہو اور اس کی تہہ میں کسی فرد یا پوری جماعت کے لیے ناپسندیدگی، مخاصمت یا عداوت بھی موجود ہو، تب بھی، تحقیق، صحیح علم، دیانت اور معروضیت کے تقاضوں کو ملحوظ رکھا جانا چاہیے۔ اگر یہ تقاضے ملحوظ نہ رکھے گئے تو بھی ہم یہ حسنِ ظن رکھتے ہیں کہ زیادہ تر اس کی وجہ دانستہ شرارت نہ رہی ہوگی، بلکہ لاعلمی، تحقیق سے گریز اور سنسنی خیزی کی خواہش رہی ہوگی۔ پھر، جماعت کا نظم اور طریقِ انتخاب منفرد نوعیت کے ہیں، لیکن انسانی ذہن، فہم کی سہولت اور کاہلی کی وجہ سے، ہر چیز کو اسی سانچہ میں ڈھال کر سمجھتا اور بیان کرتا ہے جس سے وہ واقف ہے۔ کیونکہ دلچسپی لینے والے پارٹی سسٹم اور انتخابات کے اسی ماڈل سے واقف تھے جو ملک میں رائج ہے، اس لیے بھی شاید انھوں نے جماعت کے نظم اور انتخابات کو جتھہ بندی، امیدواری، اور فتح و شکست کی رائج تعبیرات کے سانچے میں ڈھال دیا، اور صحیح صورتِ حال معلوم کر لینے کی کوئی زحمت نہ اٹھائی۔

جماعتِ اسلامی اس ملک کی وہ واحد جماعت ہے جس کا نظام مکمل طور پر دستوری اور جمہوری ہے۔ یہاں روزِ اوّل سے تمام مناصب کے لیے، دستور کے مطابق، باقاعدگی سے انتخابات ہوتے ہیں۔ لیکن جماعت میں نہ جتھہ بندی ہے، نہ امیدواری، نہ کنویسنگ، نہ فتح و شکست، بلکہ منصب کی خواہش اور اس کے حصول کی کوشش اگر ظاہر ہوجائے تو آدمی منصب کے لیے نااہل قرار پاتا ہے۔ ۱۹۷۲ کے بعد سے صرف مرکزی اور صوبائی امارت کے لیے متعلقہ شوریٰ، خفیہ رائے دہی کے ذریعے بیلٹ پیپر پر، صرف رہنمائی کے لیے، تین نام درج کرتی ہے۔ مگر ہر رکن اپنے بیلٹ پر اس شخص کے حق میں رائے دیتا ہے جس کو وہ اپنے علم و ضمیر کے مطابق متعلقہ منصب کے لیے اہل تر سمجھتا ہے۔ تمام انتخابات کا نتیجہ کثرتِ رائے پر منحصر ہوتا ہے۔ یہ دعویٰ کوئی انسانی جماعت نہیں کرسکتی کہ اس کے اندر کبھی کوئی خامی، کوتاہی، یا اصول کی خلاف ورزی وقوع پذیر نہیں ہوتی۔ لیکن یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ایسے واقعات شاذ ہیں، اور بالعموم جماعت اپنے دستور اور نظام پر کاربند رہی ہے۔

اس لحاظ سے، اس نوعیت کی سرخیوں اور تجزیوں کا حقیقت سے دور کا بھی تعلق نہ تھا کہ

"تین امیدواروں کے درمیان مقابلہ ہورہا ہے"، "اصل مقابلہ دو امیدواروں کے درمیان ہے" "قاضی حسین احمد نے ایک بار پھر مولانا جان محمد عباسی اور پروفیسر خورشید احمد کو شکست دے دی" وغیرہ وغیرہ۔

اسی طرح، کیوں کہ ہر ووٹ اہل تر آدمی کے حق میں ہوتا ہے، اور فیصلے کثرتِ رائے سے ہوتے ہیں، اس لیے اس بات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ آراء کی تعداد سے یہ ظاہر ہو کہ کون سا منتخب امیر متنازع ہے اور کون متفق علیہ۔ اگر "الف" کو ۵ ہزار ووٹ ملتے ہیں، "ب" کو ایک ہزار، "ج" کو ۵ سو، "د" کو ۵۰، تو اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ ۵ ہزار ارکان بقیہ تین پر عدم اعتماد کا اظہار کر رہے ہیں، یا ۱۵۵۰ ارکان "الف" کو نااہل سمجھتے ہیں۔ چند افراد ایسا سمجھ کر بھی ووٹ دے سکتے ہیں، لیکن بالعموم اس کے معنی اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ ۵ ہزار ارکان دفعہ ۱۳ میں مطلوبہ صفات کے درمیان وزن و موازنہ کر کے (جن میں علم و تقویٰ بھی شامل ہے اور جماعت کو چلانے کی اہلیت بھی) اس رائے تک پہنچے ہیں کہ "الف" پر نسبتاً زیادہ اعتماد کیا جاسکتا ہے۔ انتخاب، جماعت میں اعتماد اور عدم اعتماد کے لیے اکھاڑہ نہیں ہے۔ اس مقصد کے لیے دستورِ جماعت نے مرکزی مجلس شوریٰ کو اختیار دیا ہے، اور وہ امیرِ جماعت کو اس کے منصب سے معزول کر سکتی ہے۔ کوئی امیرِ جماعت ۹۸ فیصد ووٹوں سے منتخب ہو یا ۴۹ فیصد ووٹوں سے، وہ یکساں طور پر جماعت کی اطاعت، خیرخواہی، اور (اگر اختیار سے باہر نہ ہو) تو محبت کا مستحق ہوتا ہے، مقدار کم و بیش ہو سکتی ہے۔

جماعت میں جتھہ بندی کی بھی کوئی گنجائش نہیں، اگرچہ انسانی فطرت کے لحاظ سے یہ ہو سکتا ہے کہ کسی کا جھکاؤ ایک طرف ہو اور کسی کا دوسری طرف۔ اس لیے یہ سمجھنا کہ زید "الف" کے گروہ سے تعلق رکھتا ہے، اور عمر "ب" کا وفادار ہے، ایک بے معنی بات ہے۔ جماعت میں اختلاف، تنقید اور محاسبہ کی شاندار روایات موجود ہیں۔ ایسا بالعموم ہوتا ہے کہ ایک مسئلے پر زید "الف" کا ہم نوا ہے یا اس پر تنقید کر رہا ہے، تو دوسرے مسئلے پر وہ "ب" کا ہم نوا ہے یا اس کا احتساب کر رہا ہے۔ جب پالیسی سازی کے مرحلے پر بحث ہوتی ہے تو لوگ کھل کر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں۔ جب فیصلہ ہو جاتا ہے، تو اس کے بعد بھی ہر شخص کو اپنے اختلاف پر قائم رہنے کا حق رہتا ہے، اور متعلقہ مجلس میں فیصلہ کو بدلوانے کی کوشش کا حق بھی۔ ہاں، دستورِ جماعت کی رو سے اسے، کسی غیر متعلقہ مجلس میں، یا پریس اور پبلک میں، اپنا اختلاف ظاہر کرنے کا حق نہیں ہوتا۔ یہ پابندی بھی منصوص نہیں ہے، بلکہ جماعت نے اپنے نظم کے لیے طے

کر رکھی ہے۔ لیکن جس نے جماعت کے دستور کی پابندی کا حلف اٹھایا ہے۔ وہ' اپنے حلف کی وجہ سے' شرعاً" اس کی اطاعت کا پابند ہے۔ اسی بات کو محترم نعیم صدیقی نے ایک مخصوص تناظر میں یوں واضح کیا ہے :

[میاں طفیل محمد صاحب اور محترم پروفیسر غفور احمد صاحب کے] یہ اختلافات تو اتفاقاً" اور غیر متوقع طور پر سامنے آگئے' ورنہ پالیسی طے کرتے ہوئے جو بحثیں ہوتی ہیں' اگر کہیں وہ سامنے آجایا کریں تو میرا خیال ہے کہ ہر صبح اور ہر شام اپنے' بیگانے انتظار کریں کہ جماعت کی شکست و ریخت ابھی ہونے والی ہے۔ . . .

یہ اختلافات جماعت کی اندرونی زندگی میں جمہوری کردار کے مظہر ہیں۔ بلاشبہ مقررہ سطح پر اور مقررہ دائرے میں ہمارا جمہوری کردار بڑے سے بڑے اختلافات کو گوارا کرتا ہے' مگر ہمارا دستور اس کی اجازت نہیں دیتا کہ درونِ ایوان کی بحثیں اور اختلافی آراء کو باہر لے جایا جائے۔ یہ جماعت کے جمہوری کردار سے تجاوز ہے اور ہماری کمزوری ہے۔ (تحریکی شعور' ۱۹۸۹ء' ص ۴۹ – ۳۴۸)

ووٹوں کی گنتی کے بارے میں' کہ کس کو کتنے ووٹ مل رہے ہیں یا ملے ہیں' ساری خبریں من گھڑت اور بے بنیاد تھیں۔ اس سے پہلے کہ ناظمِ انتخاب گنتی شروع کرتے' یا مکمل کرکے نتائج قیم جماعت کے حوالے کرتے' اس قسم کی خبریں شائع کرنا شروع کردیا گیا۔ اسی طرح کبھی باہمی اختلافات کو انتہائی شدت تک پہنچا کر پیش کیا گیا۔ کبھی مصالحت اور مداخلت کے ذریعے معاملات طے ہوجانے کی "خوشخبری" گھڑ کر' "الف" یا "ب" کے منتخب ہونے کے امکانات روشن ہوجانے کی نوید سنائی گئی۔ حالانکہ جس وقت یہ خبریں شائع ہوئیں اس وقت تک یا تو ووٹنگ ختم ہوچکی تھی' یا ۸۰ – ۷۰ فیصد ووٹ ڈالے جاچکے تھے اور اگر کوئی مصالحت' خبر گھڑنے والوں کی اصطلاح میں' ہو بھی جاتی تو اس سے ملک کے طول و عرض میں ووٹ دینے والے ۷ ہزار سے زائد ارکان کو کیسے باخبر کیا جاسکتا تھا' اور ان کی رائے کیسے بدلی جاسکتی تھی ؟

یہ بھی کہا گیا کہ موجودہ امیرِ جماعت کے دور میں کثرت سے ارکان بنائے گئے ہیں' اور وہ انہی ارکان کے بل پر دوبارہ امیرِ جماعت منتخب ہوں گے۔ یہ بات جماعت میں طریقِ رکن سازی سے مکمل ناواقفیت یا دانستہ شرانگیزی پر مبنی ہے۔ دستور کی رو سے رکن بنانے کا اختیار امیرِ جماعت کو ضرور حاصل ہے' لیکن اب یہ اختیار امرائے اضلاع کو تفویض کیا جاچکا ہے' اور وہی اپنی اپنی مجلسِ شوریٰ کے مشورے سے رکن سازی کرتے ہیں۔ لیکن دیکھا جائے تو عملاً رکن

بنانے کا اختیار ان کے پاس بھی نہیں۔ رکن بنانے کا عمل تو ہر مقام سے شروع ہوتا ہے۔ جب تک مقام کسی کو رکن بنانے کی سفارش نہ کرے' ناظمِ ضلع اس پر کوئی کارروائی نہیں کرسکتا' اس لیے کہ درخواست اس کے پاس ہوتی ہی نہیں۔ وہ کسی کو رکن بننے سے روک تو سکتا ہے' لیکن از خود بالعموم کسی کو رکن بنا نہیں سکتا۔ اب یہ کس امیرِ جماعت کے بس میں ہو سکتا ہے' اگر وہ چاہے بھی تو' کہ وہ ہزاروں مقامات سے اپنی مرضی کے رکن بنوا لے۔ پھر' ظاہر ہے کہ کام میں وسعت کے ساتھ ارکانِ جماعت کی تعداد میں اضافہ کی شرح بڑھتی جائے گی۔ سیّد مودودیؒ کے تیس سالہ دور کے اختتام پر ۱۹۷۲ء میں ارکان کی تعداد ۲۴۹۱ تھی' محترم میاں طفیل محمد کے ۱۵ سالہ دور کے اختتام پر یہ تعداد ۵۵۲۵ تھی' یعنی ۱۰۵ فیصد اضافہ ہوا۔ گزشتہ ۵ سالوں میں ۲۳۳۶ ارکان کا اضافہ ہوا' یعنی ۴۲ فیصد۔

آخر میں ایک بات یہ بھی سنی گئی کہ جماعت میں کوئی امیر نہ آج تک ہارا ہے' نہ ہار سکتا ہے۔ یہ بات اپنی جگہ واقعتاً صحیح بھی ہو' مگر کلمۃ حق ارید بھا الباطل کی مصداق ہے۔ یہ منتخب امیر کو بے اثر کرنے کی اور اس کے انتخاب کو مجروح کرنے کی ایک کوشش محسوس ہوتی ہے (جو انشاء اللہ العزیز ناکام ہوگی)' لیکن اس کی زد منصبِ امارت پر پڑتی ہے' اور دور دور تک پہنچتی ہے۔ افراد تو آتے جاتے رہیں گے' منصب کا وقار و مقام افراد سے کہیں زیادہ اہم ہے۔ پھر یہ بات تو سیّد مودودیؒ اور محترم میاں طفیل محمد جیسے امرا کے اوپر بھی صادق آئے گی۔ ویسے غور کیا جائے تو کس ملک میں' کس پارٹی میں' کس حکومتی نظام میں' عام حالات میں سربراہِ کار کو انتخاب میں ہٹایا جاتا ہے۔ ہمارے ملک میں تو پارٹیوں کے سربراہ موروثی جاگیرداروں کی طرح قابض رہتے ہیں یا محلاتی سازشوں کے ذریعے بنتے ہیں' اور حکومتی سربراہ یا تو برطرف کیے جاتے ہیں یا قتل۔ برطانیہ میں بھی پارٹی کے سربراہ خود ہی اپنا عہدہ چھوڑتے ہیں' تو نئے سربراہ آتے ہیں۔ امریکہ کے صدارتی انتخاب میں' جہاں باقاعدہ مقابلہ ہوتا ہے اور کینویسنگ ہوتی ہے' جس صدر نے دوبارہ منتخب ہونا چاہا وہ ہوگیا' سوائے دو تین دفعہ کے کہ جب غیر معمولی مخالف حالات پیدا ہوگئے تھے۔ اسی لیے انہوں نے ۱۹۳۰ء کے بعد اپنے دستور میں ترمیم کرکے یہ طے کیا کہ کوئی شخص دو میعادوں کے بعد صدر منتخب نہیں ہو سکتا۔

جیسا ہم نے عرض کیا' جماعت باہر والوں پر کوئی قدغن نہیں لگا سکتی کہ وہ اس کے امیر کے انتخاب میں دلچسپی نہ لیں' اظہار رائے نہ کریں' خبریں نہ شائع کریں۔ اگر لگا سکتی ہوتی' تو جب بھی اس کا ایسا کرنا بجا نہ ہوتا۔ اپنے نظم کی حفاظت اس کا اپنا کام ہے' باہر والوں کا دردِ سر نہیں

ہے۔ لیکن جیسا ہم نے اوپر واضح کیا ہے' یہ ساری دلچسپی' صحافیانہ ضابطہ' اخلاق اور دیانت پر مبنی نہ تھی۔ آئندہ کے لیے ہماری درخواست یہی ہے کہ آپ دلچسپی ضرور لیں' لیکن تحقیق و دیانت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں۔

اس دلچسپی میں حصہ لینے والوں میں ایسے لوگ بھی تھے جو جماعت کے نظم میں نہیں ہیں' اس کے پابند بھی نہیں ہیں' لیکن جماعت کے لوگ ان کو "اپنا" ہی تصور کرتے ہیں۔ ان کے بھی حقِ مداخلت پر نہ اعتراض ہو سکتا ہے' نہ شکایت۔ ان میں سے اکثر' نظم باہر ہونے کے باوجود' جادۂ حق و اعتدال پر قائم رہے۔ لیکن کچھ نے شروع ہی سے دوسرے انداز و اطوار اختیار کیے۔ انہوں نے کسی کے خلاف اور کسی کے حق میں ایک مہم کا آغاز کردیا۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ یہ مہم بدنیتی اور ارادتاً" شر انگیزی پر مبنی تھی۔ اس لیے کہ دلوں کا حال تو علیم بذات الصدور ہی جانتا ہے۔ لیکن ہم یہ جانتے ہیں کہ اس مہم میں انہوں نے نہ غلط بیانی اور جھوٹ سے اجتناب کیا' نہ اتہام و افترا سے۔ انہوں نے جماعت میں دراڑ ڈالنے' افتراق و انتشار پیدا کرنے' اس کی قیادت کو مجروح کرنے' اس کو بے اثر بنانے کے لیے کسی کارروائی سے دریغ نہ کیا۔ ہر طرح کی چیزیں شائع کیں' ہر قسم کی سرخیاں لگائیں۔ ایک بات متن میں کچھ ہوتی تھی' سرخی میں کچھ اور بن جاتی تھی۔ ان سے بھی ہمیں کوئی شکایت نہیں۔ اس لیے کہ ایسے لوگ ہر زمانہ میں پائے جاتے ہیں جو جماعت سے باہر رہ کر' اور نظم کی کوئی پابندی قبول کیے بغیر' اس بات کے خواہاں ہوتے ہیں کہ جماعت ان کے پیچھے چلے' فیصلے ان کی رائے کے مطابق ہوں' ان کی آواز' گلے یا قلم کے زور پر' سب سے مقدم رہے' سب سے ارفع رہے۔ ان کے بارے میں ہماری اللہ تعالیٰ سے یہی دعا ہے کہ وہ ان کو خود اپنے بارے میں سوچنے کی توفیق دے' یہ سمجھتے ہوئے کہ استغفار اور توبہ کا دروازہ ہمیشہ کھلا ہوا ہے۔ جماعت کے رفقا سے ہم اتنا ہی کہیں گے کہ وہ کسی مسلمان بھائی سے کینہ نہ رکھیں' برائی کا جواب بھلائی سے دیں' جو کچھ ضروری سمجھیں وہ پڑھیں اور سنیں' لیکن دل کا تعلق قائم کرتے ہوئے اور کسی کے پیچھے چلتے ہوئے پرائے کو اپنا نہ سمجھ لیں' نہ اپنے کو پرایا' ورنہ وہ دھوکہ کھائیں گے اور نقصان اٹھائیں گے۔

جب باہر سے مہم چلی' کذاب وافترا سے کام لیا گیا' وسوسہ کاریاں ہوئیں' اور ان کی طرف سے جن کو اپنا سمجھا جاتا ہے' تو لازماً" جذبات میں کھولاؤ پیدا ہوا' اور چند اہلِ قلم نے اپنے قلم اٹھا لیے۔ کیوں کہ نظمِ جماعت کا دفاع ہر رکن کا فرض ہے' اس لیے ان کے اس فعل پر فی نفسہ کوئی اعتراض تو نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن بعض جگہ ان کا قلم حدِ اعتدال سے تجاوز کرگیا۔ ہم

اس سلسلے میں بھی مناسب نصیحت و تذکیر کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ اس ضمن میں قرآن مجید کی اس نوعیت کی چند ہدایات تو ہمیشہ ملحوظ رکھنا چاہئیں کہ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ "تم بدی کو اس نیکی سے دفع کرو جو بہترین ہو"۔ (حم السجدہ ۴۱ : ۳۴) وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا "اور جاہل ان کے منہ آئیں تو کہہ دیتے ہیں کہ تم کو سلام"۔ (الفرقان ۲۵:۶۳) ۔ خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِیْنَ "اے نبیؐ" نرمی و درگزر کا طریقہ اختیار کرو، معروف کی تلقین کیے جاؤ، اور جاہلوں سے نہ الجھو"۔ (الاعراف ۷: ۱۹۹)۔ خصوصاً جس اخلاقی فضیلت کی تعلیم درج ذیل حدیث میں دی گئی ہے، اس کو کبھی فراموش نہ کرنا چاہیے۔ بعض صورتوں میں اپنا دفاع ضروری ہوتا ہے، لیکن بالعموم یہ کام اللہ اور اس کے فرشتوں پر چھوڑ کر خاموشی اختیار کرنا انجامِ کار کے لحاظ سے زیادہ مفید ہوتا ہے۔ موجودہ صورتحال میں بھی ہماری رائے میں خاموشی کی روش ہی زیادہ انفع اور احسن ہوتی۔

حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے کہ ایک شخص نے حضرت ابوبکرؓ کو برا بھلا کہا۔ حضورؐ اس کے برا کہنے کو سنتے رہے، تعجب کرتے رہے، اور مسکراتے رہے۔ جب وہ شخص برا بھلا کہتا ہی چلا گیا، تو حضرت ابوبکرؓ نے اس کی بعض باتوں کا جواب دیا۔ اس پر نبیؐ کو غصہ آگیا، اور آپؐ اٹھ کھڑے ہوئے۔ حضرت ابوبکرؓ آپؐ کے پیچھے پیچھے گئے، اور کہا، یارسولؐ اللہ وہ شخص مجھے برا بھلا کہہ رہا تھا اور آپؐ تشریف فرما تھے۔ جب میں نے اس کی بعض باتوں کا جواب دیا تو آپؐ غصہ ہوگئے اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ حضورؐ نے فرمایا، تمہارے ساتھ ایک فرشتہ تھا جو اس کو جواب دے رہا تھا۔ جب تم نے خود اس کو جواب دینا شروع کردیا، تو شیطان بیچ میں کود پڑا۔ پھر آپؐ نے یہ بھی فرمایا، جس بندہ پر ظلم کیا جائے اور وہ صرف اللہ کی رضا کی خاطر خاموش رہے، اللہ اس کی زبردست مدد کرتا ہے (احمد، ابوداؤد، مشکوٰۃ)

دوسری بات یہ ہے کہ اگر جواب دینا ناگزیر ہی سمجھا جائے تو قرآن مجید کے ان تین احکام کی پابندی ضروری ہے :

۱۔ وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى (الانعام ۶:۱۵۲)

"اور جب بات کہو انصاف کی کہو، خواہ معاملہ اپنے رشتہ دار ہی کا کیوں نہ ہو۔"

۲۔ وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ (النحل ۱۶: ۱۲۶)

"اور اگر تم لوگ بدلہ لو تو بس اسی قدر لے لو جس قدر تم پر زیادتی کی گئی ہو"۔

۳ - وَجَزَآءُ سَیِّئَۃٍ سَیِّئَۃٌ مِّثْلُھَا ۚ فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُہٗ عَلَی اللّٰہِ

(الشوریٰ ۴۲:۴۰)

"برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے' پھر جو کوئی معاف کردے اور اصلاح کرے' اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہے۔"

انصاف کی اس پل صراط پر قائم رہنا کتنا دشوار ہے' اس کا اندازہ ایک واقعہ سے کیجیے:

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی آپؐ کے سامنے بیٹھ گئے' اور عرض کی: "میرے چند غلام ہیں' جو مجھ سے جھوٹ بولتے ہیں' میرے ساتھ خیانت کرتے ہیں' اور میری نافرمانی کرتے ہیں۔ میں بھی انھیں مارلیتا ہوں اور برا بھلا کہتا ہوں۔ ان کے ساتھ میرے اس معاملہ کا کیا بنے گا؟" رسولؐ اللہ نے اس سے کہا: "اتنی سزا دو جس قدر وہ تمھارے ساتھ خیانت کریں' تمھاری نافرمانی کریں' اور تم سے جھوٹ بولیں۔ اگر ان کے لیے تمھاری سزا ان کے گناہوں سے کم ہوئی تو تمھارا مزید حق باقی رہے گا۔ اگر تمھاری سزا ان کے گناہوں کے برابر ہوئی' تو معاملہ برابر برابر ہوجائے گا۔ لیکن اگر تمھاری سزا ان کے گناہوں سے بڑھ گئی' تو ان کے لیے تم سے اس زیادتی کا قصاص لیا جائے گا جو تمھاری طرف سے ہوگی۔" وہ صاحب یہ سنتے ہی رسولؐ اللہ کے سامنے ہی رونے اور چیخنے لگے۔ آپؐ نے فرمایا: "اس کو کیا ہوگیا؟ یہ اللہ کی کتاب نہیں پڑھتا! ـــــ قیامت کے روز ہم ٹھیک ٹھیک تولنے والی ترازو رکھ دیں گے' پھر کسی شخص پر ذرہ برابر ظلم نہ ہوگا ـــــ جس کا رائی کے دانے کے برابر بھی کیا دھرا ہوگا وہ ہم سامنے لے آئیں گے اور حساب لگانے کیلئے ہم کافی ہیں (الانبیاء ۲۱: ۴۷) ان صاحبؓ نے عرض کی "یارسولؐ اللہ" پھر تو میں اس سے بہتر کوئی صورت نہیں دیکھتا کہ اپنے غلاموں سے جدا ہوجاؤں۔ آپ گواہ رہیے' یہ سب آزاد ہیں۔" (الفتح الربانی الترتیب مسند احمد)

جماعت کے اندر بھی ہماری روش کی سوئی اس مقام پر نہ رہی جو اللہ اور اس کے رسولؐ اور نظامِ جماعت نے طے کردیا ہے۔ "ہماری" کا لفظ ہم نے اس لیے استعمال کیا ہے کہ ایک ساتھی غلطی کرے' کسی ایک پر الزام لگایا جائے' تو کسی نہ کسی طرح سب اس میں شریک ہوجاتے ہیں۔ اسی لیے قرآن مجید نے وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَکُمْ "آپس میں ایک دوسرے پر طعن نہ کرو"۔

(الحجرات ۴۹ : ۱۱)' اور لَوْلَاۤ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بِاَنْفُسِهِمْ خَيْرًا "جس وقت تم لوگوں نے اسے سنا تھا' اسی وقت کیوں نہ مومن مردوں اور مومن عورتوں نے اپنے آپ سے نیک گمان کیا"۔ (النور ۲۴ : ۱۲) میں "انفس" کا لفظ استعمال کیا ہے۔

اختلاف کرنا آپ کا حق ہے۔ آپ کسی پالیسی' تدبیر یا اقدام کو غلط یا مُضر بھی سمجھ سکتے ہیں۔ کسی شخص کو پسند یا ناپسند کرنے کا بھی آپ کو اختیار ہے۔ اسے کسی منصب کے لیے کم اہل' کم قابلِ اعتماد' یا بالکل نااہل اور ناقابلِ اعتماد سمجھنے کا بھی آپ کو حق ہے۔ لیکن جب تک آپ نے دستور کی پابندی کا حلف اٹھا رکھا ہے' کسی کے حق میں یا کسی کے خلاف ارکانِ جماعت یا دیگر وابستگانِ جماعت سے گفتگوئیں کرنا' تقریریں کرنا' ملک کے طول و عرض میں بھاگ دوڑ کرنا' صریحاً" نقضِ میثاق ہے۔ جس سے بھی اس غلطی کا ارتکاب ہوا اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ استغفار اور توبہ کرے۔ جماعت کے علم میں وہ آئے یا نہ آئے' وہ اس کا نوٹس لے یا نہ لے' وہ کوئی کارروائی کرے یا نہ کرے' آپ کا اصل معاملہ اپنے رب کے ساتھ ہے' اور وہ معاملہ آخرت کا معاملہ ہے' جہاں کوئی راز' راز نہ رہے گا' اور جہاں کا انجام ابدی اور لازوال ہے۔

سارے فتنوں اور فساد کی جڑ کیا ہے ؟ سوئے ظن' بغیر ثبوت الزامات لگانا اور بلا تحقیق الزامات پر یقین کرلینا' ان کو دل میں ڈال لینا اور آگے بلا جھجک بیان کردینا' اور غیبت۔جہاں بھی آپ کریدیں گے' تحقیق کریں گے' بنیاد میں یہی خرابیاں ملیں گی۔ حالانکہ بدظنی کو حرام کیا گیا ہے' ہر سنی سنائی بات کو آگے نقل کرنے والے کو جھوٹا قرار دیا گیا ہے' اور غیبت کو' جو مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھانے کے برابر ہے' زنا سے بدتر جرم کہا گیا ہے۔ بغیر ثبوت الزام لگا دینے کو آپ نے بہت ہلکا کام سمجھ لیا ہے۔ حالانکہ اس کی سنگینی اس درجہ کی ہے کہ اگر تین آدمی کسی کو اپنی آنکھ سے زنا کرتے دیکھیں تو بھی وہ اس کا یہ فعل دوسروں کے سامنے بیان نہیں کرسکتے جب تک چوتھا گواہ نہ ہو' جو ثبوت کے لیے ضروری ہے۔ ورنہ ان کے لیے ۸۰ ' ۸۰ کوڑوں کی سزا ہے۔ یہ سارے احکام اس لیے ہیں کہ مسلمان بھائی کی عزت بھی اسی طرح حرام ہے جس طرح اس کا خون اور اس کا مال' اور عزت کی حرمت ان احکام کی پابندی کے بغیر ممکن نہیں۔

اس پورے دورِ انتخاب میں باہر سے زیادہ اندر بے شمار باتیں کہی گئیں' الزامات لگائے گئے' اور ان کو پھیلایا گیا' حالانکہ وہ صریحاً" غلط تھے' اور کہنے والے ان کو کسی طرح بھی ثابت نہ کرسکتے تھے۔ سننے والے بھی "اپنے" بارے میں حسنِ ظن سے کام لینے یا کہنے والے سے ثبوت مانگنے کے بجائے ملزم سے اپنی بے گناہی کا ثبوت طلب کرتے' یا ان الزامات کو اور آگے پھیلاتے

رہے۔

کہا گیا کہ امیرِ جماعت دستور میں طے کردہ طریقِ کار کے برخلاف' جمہوری اور آئینی طریقوں سے اصلاح و انقلاب کا کام کرنے کے بجائے' اسلحہ' قوت اور تشدد کے ذرائع سے انقلاب لانا چاہتے ہیں' اور یہ ذرائع استعمال کر رہے ہیں۔ کاروانِ دعوت و محبت میں اسلحہ تقسیم کیا گیا' انسدادِ منکرات و فواحش کے لیے تشدد کرنے کی ہدایت کی گئی' مسلح رضا کاروں کی فوج منظم کرنے کا اعلان کیا گیا' پاسبان' فوج کے کہنے سے بنائی گئی ہے اور اسے ایم کیو ایم کی طرح ایک اسلحہ بردار اور دہشت گرد گروہ بنایا جا رہا ہے۔ یہ باتیں نجی گفتگوؤں میں صراحتاً" کہی گئیں' اور تقاریر میں صاف صاف کنایوں میں۔ ان میں سے کسی ایک بات کا بھی صداقت سے دور کا بھی کوئی تعلق نہیں۔ امیرِ جماعت نے ایسی کوئی بات کبھی نہیں کہی۔ دفاعِ وطن کے لیے رضاکاروں کو منظم کرنے میں "مسلح" کا کوئی ذکر نہ تھا۔ انسدادِ منکرات کے لیے قوت کے استعمال کا ذکر اسی طرح تھا جس طرح قراردادِ ماچھی گوٹھ میں کہا گیا تھا کہ "نیکی اور شرافت اب انتشار' پست ہمتی' بزدلی اور کمزوری کے ہم معنی ہو کر رہ گئی ہے۔ اس صورتِ حال کو پھر سے بدلنا ہے اور نیکی اور شرافت کو منظم' بے باک اور نڈر بنا کر اسے معاشرے کے ہر گوشے میں حکمراں طاقت کی حیثیت دینا ہے۔" پاسبان نے آج تک ظلم کے خلاف اپنے کسی احتجاج میں اسلحہ کا استعمال تو کجا' کوئی قانون شکنی بھی نہیں کی۔ یہ الزام لگاتے لگاتے بعض لوگ اتنی دور چلے گئے کہ انہوں نے جہادِ افغانستان میں شرکت کو بھی دہشت گردی اور اسلحہ کے ذریعہ انقلاب کے زمرہ میں شامل کر دیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

یہ الزام بھی لگایا گیا کہ بعض مرکزی ذمہ دارانِ جماعت' چہرہ کے پردے کے قائل نہیں ہیں' حلقہ خواتین اور جمعیتِ طالبات سے چہرہ کا پردہ ختم کرا دینا چاہتے ہیں اور مخلوط مجالس کو رواج دینا چاہتے ہیں۔ ان میں سے ہر بات اپنی جگہ پر بالکل بے بنیاد ہے۔ اگرچہ چہرہ کے پردہ کا مسئلہ اختلافی ہے' اور اس کا قائل نہ ہونا کوئی گناہ نہیں' لیکن ہمارے علم میں کوئی ایسا مرکزی ذمہ دار نہیں جو اس کا قائل نہ ہو' اور اس کے اہلِ خانہ اس پر عامل نہ ہوں۔ زیادہ سے زیادہ اگر کوئی بات کہی گئی اور صحیح کہی گئی' تو وہ اتنی کہ عورتوں کی جو بہت بڑی تعداد چہرہ کا پردہ نہیں کرتی لیکن دین کے ساتھ تعلق رکھتی ہے اور اصلاح و انقلاب کا کام کر سکتی ہے' اسے بھی اپنے ساتھ لے کر چلنے کی تدابیر پر غور کرنا ضروری ہے۔

یہ بھی کہا گیا کہ شریعت ایکٹ کو پاس کرنے میں شرکت کر کے کفر بواح کا ارتکاب کیا گیا'

جنگِ خلیج کے مسئلے پر شوریٰ کی طے کردہ پالیسی کی خلاف ورزی کی گئی' صوبہ پنجاب کی امارت کے مسئلے پر دستور کی خلاف ورزی کی گئی' اور کاروانِ دعوت و محبت نکالنے کے لیے دستوری طور پر شوریٰ سے مشورہ کرنا ضروری تھا جو نہیں کیا گیا ---- اس قسم کے سارے محاسبے شوریٰ کے سامنے پیش کیے جاچکے ہیں' ان پر تفصیلی بحثیں ہوچکی ہیں' شوریٰ ان کے بارے میں وہ فیصلے کرچکی ہے جو اس کے نزدیک صحیح تھے۔ ممکن ہے شوریٰ کے فیصلے غلط ہوں' لیکن اختلافی مسائل' وہ استنباط کے زمرہ میں آتے ہوں یا تدابیر و مصالح کے' اس کے علاوہ انہیں حل کرنے کا اور کیا طریقہ ہوسکتا ہے کہ کسی ادارہ کے فیصلے کو حتمی اور آخری تسلیم کیا جائے' اور اس کے بعد اس پر سکوت اختیار کیا جائے۔ محترم نعیم صدیقی کے الفاظ میں مشاورت "کے بعد اور کوئی طریقہ حل اختلافات موجود نہیں ہے۔ یہاں آکر تمام بحثوں کو ختم ہوجانا چاہیے" اور "چند افراد خود یا زیادہ وسیع حلقے کے اجماع تام یا اجماع ناقص کے سامنے سرتسلیم خم کردیں۔ نہ کریں تو پھر کوئی حل نہیں۔ آگے افتراق ہی افتراق اور فساد ہی فساد ہے"۔ اور اس دور میں اسی وجہ سے افتراق اور فساد ہوا۔

مناصب کی تبدیلی کے ضمن میں آمریت اور غیرفطری طریقے اختیار کرنے کی بات بھی کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں یہ امر بالکل فراموش کردیا جاتا ہے کہ جماعت کا نظام وحدانی ہے' اس میں منتخب امیر ایک ہی ہے' اور وہ امیرِ جماعتِ اسلامی پاکستان ہے۔ اس کے تحت ہر امیر کی حیثیت امیرِ جماعت کے نمائندے کی ہے' اور وہ اس کے اور دیگر امرائے بالا کے سامنے جوابدہ ہے' نہ کہ اپنی جماعت کے ارکان کے سامنے۔ اس کا عزل و نصب امیرِ جماعت کے اختیار میں ہے' جس کے لیے وہ بالاتر امرا سے مشورہ کرنے کا' جماعتی مصالح ملحوظ رکھنے کا' اور متعلقہ ارکان کی رائے کو بھی زیادہ سے زیادہ ملحوظ رکھنے کا پابند ہے۔ یہ تجویز بار بار آتی رہی ہے کہ سارے مناصب کو منتخب مناصب بنا دیا جائے۔ لیکن مجلس شوریٰ نے ہر بار اس تجویز کو اس لیے رد کردیا ہے کہ جماعتی نظام وحدانی ہے' اور اس طرح ایک جماعت میں کئی جماعتیں بن سکتی ہیں۔

اب اگر یہ سمجھا جائے کہ امیرِ جماعت اس بات کا پابند ہے کہ ہمیشہ' اُسی کو ماتحت منصب پر مقرر کرے' جس کے حق میں استصواب میں سب سے زیادہ آراء آئیں' تو اس کا دستوری اختیارِ عزل و نصب ایک بے معنی اختیار ہے' اور جماعتی مصالح ملحوظ رکھنے اور بالاتر امرا سے مشورے کی دستوری دفعات بھی بے معنی ہیں۔ اس لحاظ سے اگر امیرِ جماعت کسی ماتحت منصب پر کسی ایسے فرد کو امیر یا ناظم مقرر کردے جو دوسرے یا تیسرے نمبر پر ہو' اور اسے مداخلت قرار دے کر اس

کے خلاف پراپیگنڈہ کیا جائے' تو نہ صرف اس کا کوئی جواز نہیں' بلکہ اس پر استغفار ضروری ہے۔

پھر اگر امیر جماعت کسی ماتحت منصب میں جماعتی مصالح کے لحاظ سے کسی تبدیلی کی ضرورت محسوس کرے' تو دستور کی رو سے اس کا اولین فریضہ کیا ہے؟ یہ کہ وہ استصواب کرکے ارکان کی رائے معلوم کرے تاکہ وہ اس رائے کو زیادہ سے زیادہ ملحوظ رکھنے کا دستوری تقاضا پورا کرسکے۔ وہ کسی ایک فرد کے لیے بھی استصواب کراسکتا ہے' وہ بیلٹ پر اس فرد کے نام کا اضافہ بھی کرنے کا حکم دے سکتا ہے' جس کے بارے میں وہ ارکان کی رائے معلوم کرنا چاہتا ہے۔ لیکن اگر وہ یہ سب کچھ نہیں کرتا' بلکہ صرف متعلقہ شوریٰ سے یہ کہتا ہے کہ وہ بیلٹ پر نام ڈالنے سے پہلے اس کے مجوزہ نام یا ناموں پر بھی غور کرے' تو اس پر مداخلت' آمریت اور دستور کی خلاف ورزی کا شور و غوغا اٹھانے کا کیا جواز ہے؟ جبکہ نظیر' یہ بھی موجود ہے کہ اگر مرکزی نظم نے تین میں سے کسی ایک نام کو موزوں نہ پایا' تو اس نے استصواب ہی ملتوی کردیا۔ کیا امیرِ جماعت عزل و نصب کے اپنے اختیار سے دست بردار ہوجائے' یا ارکان کی رائے معلوم کیے اور ملحوظ رکھے بغیر صرف اپنی صوابدید سے امیر مقرر کردے؟

یہ بھی کہا گیا کہ اب روایت شکنی کرکے امیر پہلے مقرر کردیا جاتا ہے' اور استصواب بعد میں ہوتا ہے۔ حالانکہ یہ روایت تو بہت پرانی ہے۔ ہمارے علم کی حد تک تو اب تک صوبہ پنجاب کا کوئی امیر ایسا نہیں ہوا ہے جسے مقرر پہلے نہ کیا گیا ہو' اور اس کے لیے استصواب بعد میں نہ کرایا گیا ہو۔ اسی طرح جب مغربی پاکستان کا صوبائی نظام بنا تو امیر پہلے مقرر ہوا' استصواب بعد میں ہوا۔ حتیٰ کہ سیّد مودودیؒ کے بعد جب امیرِ جماعت کا انتخاب ہوا' تو اس سے پہلے قائم مقام امیرِ جماعت کا تقرر ہوچکا تھا۔ اس طریقِ کار میں آخر کیا چیز آمرانہ یا غیر فطری ہے؟

یہاں ایک بات اور بھی ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ ہر ماتحت منصب کے حامل کو' امیرِ جماعت کا نمائندہ ہونے کے باوجود' اس بات کا پورا حق ہے کہ وہ اس پر' مقررہ مجالس میں یا بالمشافہ گفتگو میں' تنقید کرے' اس کا احتساب کرے' اس سے اختلاف کرے' اس سے وضاحت طلب کرے' بلکہ ایسا کرنا اس کا فریضہ ہے۔ لیکن اگر کوئی سمجھے کہ امیرِ جماعت' جماعت کو غلط رخ پر لے جارہا ہے' دستور کی خلاف ورزی کررہا ہے' آمریت کی روش پر گامزن ہے' پھر وہ کسی مجلس یا بالمشافہ گفتگو میں تو کوئی اختلاف و احتساب نہ کرے' مگر نجی گفتگوؤں میں "جماعت بچاؤ" کی مہم چلائے' جگہ جگہ اس پر تنقید کرتا پھرے' تو ایسا کرنے کی نہ کوئی دینی گنجائش ہے اور نہ اخلاقی' اور امیر جماعت کے نمائندے کے طور پر تو' اس کی دیانت اور ضمیر کے بھی خلاف ہوگا۔

پاسبان کے سلسلے میں بھی بہت ساری باتیں کہی گئی ہیں۔ جہاں تک اس قسم کے بے بنیاد الزامات کا تعلق ہے کہ یہ "غنڈوں کی جماعت ہے" یا "سی آئی اے نے بنوائی ہے" یا "وہ اسلحہ کے بل پر لاکھوں روپے وصول کررہی ہے" تو ان امور کا فیصلہ ہم احکم الحاکمین پر چھوڑتے ہیں۔ وہاں ہر شخص الزام لگانے والے کا دامن پکڑ سکتا ہے کہ میرے اوپر اپنا الزام ثابت کرو۔ لیکن ہم پاسبان کے بارے میں تنظیمی فیصلہ کی حیثیت ضرور واضح کرنا چاہتے ہیں۔

مرکزی مجلسِ عاملہ نے اپنے اجلاس منعقدہ ۳۰ اکتوبر ۱۹۹۰ میں ایک کمیٹی اس غرض کے لیے بنائی کہ جماعت کے گردِ متحرک افراد کا دائرہ کس طرح وسیع کیا جائے۔ اس کمیٹی میں صوبہ بلوچستان کے امیر، صوبہ سرحد و پنجاب کے قیمین، حلقہ ہائے کراچی و سکھر کے امرا بھی شامل تھے۔ اس کمیٹی نے تمام متعلقہ افراد کو ایک سوالنامہ جاری کیا۔ پھر اس نے اپنی پہلی رپورٹ میں "پاسبان" قائم کرنے کی تجویز پیش کی۔ یہ رپورٹ، مرکزی مجلس شوریٰ کے اجلاس منعقدہ ۱۱ تا ۱۴ دسمبر سے پہلے، عاملہ کے اجلاس میں پیش ہوئی جس نے اسے مجلسِ شوریٰ کے سامنے پیش کرنے کی منظوری دے دی۔ مجلسِ شوریٰ کے اجلاس میں یہ تجویز پیش کی گئی، اور اس پر تفصیل سے ایک وقت تک بحث بھی ہوئی۔ اس کے بعد مجلسِ شوریٰ نے "پاسبان" قائم کرنے کی منظوری دی، جس کو شوریٰ کی کارروائی میں ریکارڈ کیا گیا، اور جس کی شوریٰ کے اگلے اجلاس میں توثیق کی گئی۔ ایک سال گزرنے کے بعد پاسبان کے سال بھر کے کام کی رپورٹ، پہلے عاملہ کے اجلاس میں، اور اس کے بعد شوریٰ کے اجلاس منعقدہ ۱۷ تا ۲۰ دسمبر ۱۹۹۱ میں پیش کی گئی۔ مجلس شوریٰ نے اس رپورٹ کی توثیق کی، اور پاسبان کی رہنمائی اور نگرانی کے لیے ایک کمیٹی بھی بنا دی۔

پاسبان کے خیال اور کارکردگی سے اختلاف کیا جاسکتا ہے۔ پاسبان کی کارکردگی پر عدم اطمینان ہوسکتا ہے۔ پاسبان نے غلطیاں بھی کی ہیں۔ لیکن یہ کہنا کہ مجلسِ شوریٰ نے پاسبان بنانے کا فیصلہ ہی نہیں کیا، ضد اور ہٹ دھرمی کے علاوہ کیا ہوسکتا ہے؟ اس پر مزید یہ سوال اٹھانا کہ یہ فیصلہ کس ماحول میں کس طرح ہوا تو ایک بہت خطرناک عمل ہے۔ پھر تو ماچھی گوٹھ سے لے کر آج تک کے، اور اس سے پہلے کے کئی اہم فیصلوں کے بارے میں بھی یہ سوال اٹھایا جاسکتا ہے کہ صرف یہی نہ دیکھا جائے کہ فیصلہ ہوا، بلکہ یہ بھی دیکھا جائے کہ وہ کس ماحول میں ہوا۔ ورنہ اسے شوریٰ کا فیصلہ تسلیم کرنے سے انکار کردیا جائے گا۔

ہم سمجھتے ہیں کہ اب جب کہ ارکانِ جماعت، امیرِ جماعت کا انتخاب کرچکے ہیں، ہمیں ان ساری بحثوں کو ختم کردینا چاہیے، اور یکسو ہو کر جماعت اور تحریک کا کام آگے بڑھانے میں لگ

جانا چاہیے۔ ہمیں یہ بھی طے کرلینا چاہیے کہ ہم اپنے اختلافات کو دستوری طریقوں اور دستوری اداروں ہی میں حل کرنے کی کوشش کریں گے' اور ان کے اظہار کو دستوری حدود کے اندر رکھیں گے۔ باہمی محبت' حسنِ ظن' اعتماد اور تعاون کے ساتھ جماعت کو چلائیں گے۔ اس کے علاوہ صلاح و خیر کی اور کوئی راہ نہیں۔

دستور کے تحت جماعتِ اسلامی پاکستان کے امیر پر نظمِ جماعت اور تحریک دونوں کو چلانے کی آخری ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے اس مرحلہ پر جب وہ مزید پانچ سال کے لیے امارت کا منصب سنبھال رہے ہیں' چند امور ان کے اور ہم سب کے سامنے رہنا ضروری ہیں۔

پہلی بات یہ ہے کہ دنیا کی تاریخ جس موڑ پر کھڑی ہے' امتِ مسلمہ کو جو سنگین چیلنج درپیش ہے' اور ہمارا ملکِ عزیز خطرہ کے جس دہانہ پر کھڑا ہے' اس کا تقاضا ہے کہ ہم اصلاح و انقلاب کے لیے اپنی مساعی تیز سے تیز تر کردیں' اور جلدی سے جلدی ' جتنی عجلت سے ممکن ہو' اپنی منزل تک پہنچنے کی کوشش کریں۔ اس فکر میں کہ سب ہماری دعوت قبول کرلیں' سب ہمارا ساتھ دیں' اور نصرت و فتح جلد از جلد ہمارا مقدر بنے' ہمارا دم گھٹنے لگے' یہ اللہ تعالیٰ کو بہت محبوب ہے۔ ہاں' جو عجلت اس کو ناپسند ہے یہ وہ عجلت ہے جس کی وجہ سے ہم اپنی مساعی کو بار آور نہ ہوتے دیکھ کر اپنی قوم کو ہی کوسنے بیٹھ جائیں یا اس کی تباہی و ہلاکت کی دعا کرنے لگیں۔ یا وہ عجلت جس کی وجہ سے ہم اپنے بنیادی اصولوں میں تغیر و تبدل اور حذف و اضافہ پر آمادہ ہونے لگیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ ہمارے طے کردہ طریقِ کار کا منطقی تقاضا یہ ہے کہ ہم اپنے اس معاشرہ سے قوت کی وہ آخری رمق بھی حاصل کرلیں جو نظامِ فساد و ظلم کو ختم کرنے اور نظامِ صلاح و خیر کو قائم کرنے کے کام آسکے۔ سب لوگ ایک معیار پر نہیں آسکتے۔ بگڑے ہوئے معاشروں سے ہی وہ قوت حاصل کرنا ہوگی جو اس معاشرہ کو سدھار دے۔ اس قوت میں السابقون السابقون بھی ہوں گے اور اصحاب الیمین بھی۔ اس میں سابق بالخیرات بھی ہوں گے اور مقتصد بھی۔ ان سب کو للّہیت' مقصد کے عشق اور باہمی اخوت و محبت کے سیمنٹ سے جوڑ کر ہی وہ بنیان مرصوص تیار ہوگی جو اللہ کے راستے میں جہاد کرے گی' اور جو اللہ کو محبوب ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ تیزی سے بدلتے ہوئے زمانے میں' سرعت کے ساتھ رونما ہونے والے تغیرات کے دور میں' جیٹ اور ڈش انٹینا کے ذریعے سکڑتے ہوئے فاصلوں کی دنیا میں' ہم

کو اس زبردست مجتہدانہ صلاحیت کا مظاہرہ کرنا ہوگا' جس کا ذکر سیّد مودودیؒ برابر کرتے رہے' اور جس کے بغیر نہ امامتِ عالم حاصل ہو سکتی ہے' نہ ایک تہذیب کی تعمیر ممکن ہے۔

چوتھی بات یہ ہے کہ جہاں عوامی قوت' انقلاب کے لیے ناگزیر ہے' وہاں انقلاب کے مقاصد کے حصول کے لیے رجالِ کار بھی درکار ہیں' ایسے رجالِ کار جو ایک طرف مرجع خلائق ہوں اور عوام کو سنبھالنے کی صلاحیت رکھتے ہوں' تو دوسری طرف ایک نئی تہذیب وتمدن کے معمار بھی بن سکتے ہوں۔

پانچویں بات یہ ہے کہ ایک طرف عوام کو جمع کرنا اور متحرک کرنا بھی ضروری ہے' دوسری طرف وسیع پیمانے پر ان کی دینی اور اخلاقی تربیت کو عام کرنا بھی ناگزیر ہے۔ دینی اور اخلاقی طور پر کمزور معاشرے دین و شریعت کی عمارت کا بوجھ نہیں اٹھا سکتے۔

چھٹی بات یہ ہے کہ گزشتہ ۵۰ سال میں کئی نسلوں نے اپنی لگن' صلاحیت اور محنت سے' کتاب و سنت کی اطاعت اور روایات کے قیام سے' جماعتِ اسلامی کا جو قیمتی اثاثہ ہمیں منتقل کیا ہے' ہم اسے اور زیادہ طاقتور' جان دار اور متحرک بنائیں۔ اس لیے کہ بالآخر ہم جو کچھ قوت جمع کریں گے' اور جو کام کریں گے' وہ کسی نام سے ہو' کسی انداز میں ہو' کسی تدبیر سے ہو' اس کی بنیاد تو جماعتِ اسلامی ہی رہے گی۔ اشخاص و روایات' کتاب و سنت نہیں اور نہ وہ معیارِ حق ہیں' لیکن وہ کسی بھی اجتماعیت کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت ہیں۔ روایات اور تدابیر پہلے بھی بدلتی رہی ہیں' اور آئندہ بھی بدلیں گی۔ لیکن ہر تبدیلی کی پشت پر غور و فکر' اجتہاد اور زیادہ سے زیادہ اتفاق ضروری ہے۔

ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے ساتھ جوڑے' صرف اپنا بن کر رہنے کی توفیق دے' صحیح تہذیبی و تاریخی ادراک عطا کرے' اور تاریخِ عالم کے اس موڑ پر اپنا فریضہ صحیح صحیح انجام دینے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

اسلامی نظامِ جماعت

اسلام میں جماعتی زندگی کے قواعد

پہلی چیز یہ ہے کہ جماعت کے ہر فرد کو نظامِ جماعت کا بحیثیتِ مجموعی' اور جماعت کے افراد کا فرداً فرداً' سچے دل سے خیر خواہ ہونا چاہیے۔

جماعت کی بدخواہی' یا افراد جماعت سے کینہ' بغض' حسد' بدگمانی اور ایذا رسانی وہ بدترین جرائم ہیں جن کو اللہ اور اس کے رسولؐ نے ایمان کے منافی قرار دیا ہے۔

دوسری چیز یہ ہے کہ آپ کی اس جماعت کی حیثیت دنیوی پارٹیوں کی سی نہیں ہے جن کا تکیہ کلام یہ ہوتا ہے کہ "میری پارٹی' خواہ حق پر ہو' یا ناحق پر"۔ نہیں' آپ کو جس رشتہ نے ایک دوسرے سے جوڑا ہے وہ دراصل اللہ پر ایمان کا رشتہ ہے' اور اللہ پر ایمان کا اولین تقاضا یہ ہے کہ آپ کی دوستی اور دشمنی' محبت اور نفرت جو کچھ بھی ہو اللہ کے لیے ہو۔ آپ کو اللہ کی فرمانبرداری میں ایک دوسرے سے تعاون کرنا ہے نہ کہ اللہ کی نافرمانی میں۔ تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ۔

اللہ کی طرف سے جماعت کی خیر خواہی کا جو فرض آپ پر عائد ہوتا ہے اس کے معنی صرف یہی نہیں ہیں کہ بیرونی حملوں سے آپ اس کی حفاظت کریں' بلکہ یہ بھی ہیں کہ ان اندرونی امراض سے بھی اس کی حفاظت کے لیے ہر وقت مستعد رہیں جو نظامِ جماعت کو خراب کرنے والے ہیں۔ جماعت کی سب سے بڑی خیر خواہی یہ ہے کہ اس کو راہِ راست سے نہ ہٹنے دیا جائے' اس میں غلط مقاصد اور غلط خیالات اور غلط طریقوں کے پھیلنے کو روکا جائے' اس میں کسی کا استبداد نہ چلنے دیا جائے' اس میں کسی دنیوی غرض یا کسی شخصیت کو بت نہ بننے دیا جائے' اور اس کے دستور کو بگڑنے سے بچایا جائے۔

اسی طرح اپنے رفقاءِ جماعت کی خیر خواہی کا جو فرض آپ میں سے ہر شخص پر عائد ہوتا ہے' اس کے معنی یہ ہرگز نہیں ہیں کہ آپ اپنی جماعت کے آدمیوں کی بے جا حمایت کریں اور ان کی

غلطیوں میں ان کا ساتھ دیں' بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ معروف میں ان کے ساتھ تعاون کریں اور منکر میں صرف عدم تعاون ہی پر اکتفا نہ کریں' عملاً ان کی اصلاح کی بھی کوشش کریں۔ایک مومن دوسرے مومن کے ساتھ سب سے بڑی خیر خواہی جو کر سکتا ہے وہ یہ ہے کہ جہاں اس کو راہ راست سے بھٹکتے ہوئے دیکھے وہاں اسے سیدھا رستہ دکھائے اور جب وہ اپنے نفس پر ظلم کررہا ہو تو اس کا ہاتھ پکڑلے۔

البتہ آپس کی اصلاح میں یہ ضرور پیش نظر رہنا چاہیے کہ نصیحت میں عیب چینی اور خردہ گیری اور تشدد کا طریقہ نہ ہو بلکہ دوستانہ دردمندی واخلاص کا طریقہ ہو۔جس کی آپ اصلاح کرنا چاہتے ہیں اس کو آپ کے طرزِ عمل سے یہ محسوس ہونا چاہیے کہ اس اخلاقی بیماری سے آپ کا دل دکھتا ہے نہ کہ اس کو اپنے سے فروتر دیکھ کر آپ کا نفسِ متکبر لذّت لے رہا ہے۔

تیسری بات جس کی طرف میں ابھی اشارہ کرچکا ہوں' مگر جس کی اہمیت اس کی متقاضی ہے کہ اسے واضح طور پر بیان کیا جائے' یہ ہے کہ جماعت کے اندر جماعت بنانے کی کوشش کبھی نہ ہونی چاہیے۔ سازشیں' جتھہ بندیاں' نجویٰ' عہدوں کی امیدواری' حمیّتِ جاہلیہ اور نفسانی رقابتیں' یہ وہ چیزیں ہیں جو ویسے بھی جماعتوں کی زندگی کے لیے سخت خطرناک ہوتی ہیں' مگر اسلامی جماعت کے مزاج سے تو ان چیزوں کو کوئی مناسبت ہی نہیں ہے۔ اسی طرح غیبت اور تنابز بالالقاب اور بدظنی بھی جماعتی زندگی کے لیے سخت مہلک بیماریاں ہیں جن سے بچنے کی ہم سب کو کوشش کرنی چاہیے۔

چوتھی بات یہ ہے کہ باہمی مشاورت جماعتی زندگی کی جان ہے' اس کو کبھی نظرانداز نہ کرنا چاہیے۔ جس شخص کے سپرد کسی جماعتی کام کی ذمہ داری ہو اس کے لیے لازم ہے کہ اپنے کاموں میں دوسرے رفقاء سے مشورہ لے اور جس سے مشورہ لیا جائے اس کا فرض ہے کہ نیک نیتی کے ساتھ اپنی حقیقی رائے کا صاف صاف اظہار کرے۔ جو شخص اجتماعی مشاورت میں اپنی صوابدید کے مطابق رائے دینے سے پرہیز کرتا ہے وہ جماعت پر ظلم کرتا ہے اور جو کسی مصلحت سے اپنی صوابدید کے خلاف رائے دیتا ہے وہ جماعت کے ساتھ غدر کرتا ہے' اور جو مشاورت کے موقع پر اپنی رائے چھپاتا ہے اور بعد میں جب اس کے منشاء کے خلاف کوئی بات طے ہوجاتی ہے تو جماعت میں بددلی پھیلانے کی کوشش کرتا ہے' وہ بدترین خیانت کا مجرم ہے۔

پانچویں بات یہ ہے کہ جماعتی مشورے میں کسی شخص کو اپنی رائے پر اتنا مُصِر نہ ہونا چاہیے کہ یا تو اس کی بات مانی جائے ورنہ جماعت سے تعاون نہ کرے گا یا اجماع کے خلاف عمل کرے

گا۔ بعض نادان لوگ بربنائے جہالت اس کو حق پرستی سمجھتے ہیں' حالانکہ یہ صریح اسلامی احکام اور صحابہ کرامؓ کے متفقہ تعامل کے خلاف ہے۔ خواہ کوئی مسئلہ کتاب وسنت کی تعبیر اور نصوص سے کسی حکم کے استنباط سے تعلق رکھتا ہو یا دنیوی تدابیر سے متعلق ہو' دونوں صورتوں میں صحابہ کرامؓ کا طرز عمل یہ تھا کہ جب تک مسئلہ زیرِ بحث رہتا' اس میں ہر شخص اپنے علم اور اپنی صوابدید کے مطابق پوری صفائی سے اظہارِ خیال کرتا اور اپنی تائید میں دلائل پیش کرتا تھا' مگر جب کسی شخص کی رائے کے خلاف فیصلہ ہو جاتا تو وہ یا تو اپنی رائے واپس لے لیتا تھا' یا اپنی رائے کو درست سمجھنے کے باوجود فراخ دلی کے ساتھ جماعت کا ساتھ دیتا تھا' جماعتی زندگی کے لیے یہ طریقہ ناگزیر ہے' ورنہ ظاہر ہے کہ جہاں ایک شخص اپنی رائے پر اس قدر مصر ہو کہ جماعتی فیصلوں کو قبول کرنے سے انکار کر دے' وہاں آخر کار پورا نظامِ جماعت درہم برہم ہو کر رہے گا۔

آخری چیز جو جماعتی زندگی کے لیے اہم ترین ہے وہ یہ ہے کہ "اسلام بغیر جماعت کے نہیں ہے' اور جماعت بغیر امارت کے نہیں ہے"۔ اس قاعدہ کلیہ کے بموجب آپ کے لیے ضروری ہے کہ جماعت بننے کے ساتھ ہی آپ اپنے لیے ایک امیر منتخب کرلیں۔

امیر کے انتخاب میں آپ کو جو امور ملحوظ رکھنے چاہئیں وہ یہ ہیں کہ کوئی شخص جو امارت کا امیدوار ہو' اسے ہرگز منتخب نہ کیا جائے۔ کیونکہ جس شخص میں اس کارِ عظیم کی ذمہ داری کا احساس ہو گا وہ کبھی اس بار کو اٹھانے کی خواہش نہ کرے گا' اور جو اس کی خواہش کرے گا وہ دراصل نفوذ و اقتدار کا خواہش مند ہو گا نہ کہ ذمہ داری سنبھالنے کا۔ اس لیے اللہ کی طرف سے اس کی نصرت و تائید کبھی نہ ہو گی۔ انتخاب کے سلسلہ میں لوگ ایک دوسرے سے نیک نیتی کے ساتھ تبادلہ خیالات کر سکتے ہیں' مگر کسی کے حق میں یا کسی کے خلاف نجویٰ اور سعی نہ ہونی چاہیے۔ شخصی حمایت و موافقت کے جذبات کو دل سے نکال کر بے لاگ طریقہ سے دیکھیے کہ آپ کی جماعت میں کون ایسا شخص ہے جس کے تقویٰ' علم کتاب وسنت' دینی بصیرت' تدبر' معاملہ فہمی اور راہِ خدا میں ثبات واستقامت پر آپ سب سے زیادہ اعتماد کر سکتے ہیں۔ پھر جو بھی ایسا نظر آئے' اللہ پر توکل کر کے اسے منتخب کر لیجیے۔ اور جب آپ اسے منتخب کر لیں تو اس کی خیر خواہی' اس کے ساتھ مخلصانہ تعاون' معروف میں اس کی اطاعت' اور منکر میں اس کی اصلاح کی کوشش آپ کا فرض ہے۔

اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی اچھی طرح سمجھ لیں کہ اسلامی جماعت میں امیر کی وہ حیثیت نہیں ہے جو مغربی جمہوریتوں میں صدر کی ہوتی ہے۔ . . وہ لوگ خود اپنے منتخب کردہ صدر پر اعتماد

نہیں کر سکتے، ہمیشہ اس کی بے ایمانی سے غیر مامون رہتے ہیں، اور اپنے دستور میں طرح طرح کی پابندیاں اور رکاوٹیں عائد کر دیتے ہیں تاکہ وہ خدا سے زیادہ اقتدار حاصل کر کے مستبد فرمانروا نہ بن جائے۔ مگر اسلامی جماعت کا طریقہ یہ ہے کہ وہ سب سے پہلے اپنے صاحبِ امر کے انتخاب میں تقویٰ اور دیانت ہی کو تلاش کرتی ہے، اور اس بنا پر وہ اپنے معاملات پورے اعتماد کے ساتھ اس کے سپرد کرتی ہے۔ لہٰذا مغربی طرز کی جمہوری جماعتوں کی تقلید کرتے ہوئے اپنے دستور میں اپنے امیر پر وہ پابندیاں عائد کرنے کی کوشش نہ کیجیے جو عموماً وہاں صدر پر عائد کی جاتی ہیں۔ اگر آپ کسی کو خدا ترس اور متدین پاکر اسے امیر بناتے ہیں تو اس پر اعتماد کیجیے۔ اور اگر آپ کے نزدیک کسی کی خدا ترسی و دیانت اس قدر مشتبہ ہو کہ آپ اس پر اعتماد نہیں کر سکتے تو اس کو سرے سے منتخب ہی نہ کیجیے۔ (روداد، اول، ص ۲۲ تا ۲)

جماعتی اوصاف

جماعتی نظم کو مستحکم اور کار گر بنانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ارکان جماعت کے درمیان محبت و ہمدردی ہو، آپس میں حسن ظن ہو، بے اعتمادی کی جگہ اعتماد ہو، آپس میں مل کر کام کرنے کی صلاحیت ہو، ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کرنے کی عادت ہو، خود آگے بڑھیں اور دوسروں کو اپنے ساتھ آگے بڑھائیں۔ یہ اوصاف ہر جماعتی نظم کے لیے ناگزیر ہیں۔ ورنہ اگر فرداً فرداً سب لوگ اعلیٰ درجہ کی صفاتِ حسنہ اپنے اندر پیدا کرلیں لیکن منظم و مربوط نہ ہوں، آپس میں متعاون نہ ہوں، شانہ سے شانہ ملا کر چل نہ سکیں تو ہم دنیا میں علم برداران باطل کا بال تک بیکا نہیں کر سکتے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ شخصی حیثیت سے بہترین انسان ہم میں ہمیشہ موجود رہے ہیں اور آج بھی موجود ہیں۔ اور اگر آج دنیا بھر کو ہم چیلنج دے کر کہیں کہ ایسے لوگ کسی کے پاس نہ ہوں گے تو شاید اس چیلنج کا جواب کسی قوم سے نہ دیا جاسکے گا، مگر یہ معاملہ صرف انفرادی اصلاح کی حد تک ہے۔ جن لوگوں نے اپنی انفرادی اصلاح میں کمال حاصل کیا ہے انہوں نے زیادہ سے زیادہ یہ کیا کہ چند سو یا چند ہزار افراد پر اپنا اثر پھیلا دیا اور تقدس کی چند یادگاریں چھوڑ کر رخصت ہوگئے۔ یہ طریقہ بڑے کام کرنے کا نہیں ہے۔...

انفرادی تزکیہ کے لحاظ سے ہماری اپنی جماعت میں بھی ایسے رفقا کی کمی نہیں ہے جن کی حالت پر خود مجھے رشک آتا ہے مگر جہاں تک جماعتی تزکیہ کا تعلق ہے، حالات افسوسناک ہیں۔...

قرآن میں اس مسئلہ پر اصولی حد تک مفصل روشنی ڈالی گئی ہے اور حدیث میں اصول کی مکمل تشریحات موجود ہیں۔ پھر سیرتِ نبویؐ اور سیر الصحابہؓ کے مطالعہ سے مطلوبہ اجتماعی اخلاق کے عملی نمونے بھی ملاحظہ کیے جاسکتے ہیں۔ ان چیزوں کی ورق گردانی کیجیے اور ناپ تول کر دیکھیے کہ کس پہلو سے ہمارے اجتماعی نظم میں کیا اور کتنی کمی ہے' اور اس کمی کو پورا کرنے کی فکر کیجیے۔

صاف بات ہے کہ اجتماعی نظم میں ایک فرد کو دوسرے افراد سے لامحالہ سابقہ پیش آتا ہے۔ اگر حسنِ ظن' ہمدردی' ایثار اور رواداری نہ ہو تو مزاجوں کا اختلاف تعاون کو چار دن بھی جاری نہیں رہنے دے گا۔ جماعتی نظم چلتا ہی اس اصول پر ہے کہ دوسروں کے لیے آپ اپنا کچھ چھوڑیں اور دوسرے آپ کے لیے کچھ چھوڑیں۔ اس ایثار کی ہمت نہ ہو تو کسی انقلاب کا نام بھی زبان پر نہ لانا چاہیے (روداد' دوم' ص ۳۵ تا ۳۷)

اطاعت اور جماعتی قوت

میں آپ حضرات کا بہت شکر گزار ہوں کہ آپ میری طرف سے دعوت کی ایک ہی صدا سن کر ہندوستان کے مختلف گوشوں سے موجودہ زمانے کے پرصعوبت سفر کی تکلیفیں برداشت کرتے ہوئے یہاں جمع ہوگئے۔ اس طرح میری آواز پر لبیک کہہ کر آپ نے میری طاقت میں بھی اضافہ کیا اور اپنی طاقت میں بھی۔ ایسا نہ کرتے تو میں اپنی جگہ کمزور ہوجاتا اور آپ اپنی جگہ' اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہماری یہ تحریک' جو ایک بہت بڑے عزم کا اظہار ہے' خود بخود منتشر کر رہ جاتی۔

آپ جب کسی شخص کو کسی مقصد عظیم کے لیے خود اپنا امیر بناتے ہیں تو اس کی اطاعت کرکے دراصل اپنی ہی طاقت کو مضبوط کرتے ہیں۔ جس قدر زیادہ آپ کے اندر انانیت و خودپسندی ہوگی' اور جتنی کم اطاعت کا اظہار آپ سے ہوگا' اتنا ہی آپ کا اپنا بنایا ہوا امیر کمزور ہوگا' اور اسی قدر اس کی کمزوری کی وجہ سے آپ کی جماعتی طاقت ضعیف ہوگی اور اس کے برعکس جس قدر زیادہ آپ کے قلب و دماغ پر اپنے مقصد کا عشق حاوی ہوگا' اور اس عشق میں جتنا زیادہ آپ اپنی خودی کو فنا کریں گے' اور جتنی زیادہ اپنے مقصد کی خاطر اطاعت امر کا صدور آپ سے ہوگا' اسی قدر زیادہ آپ کا مرکز قوی ہوگا اور آپ کی جماعتی طاقت زبردست ہوگی۔

میں یہ دیکھ کر اکثر اپنی جگہ خوش ہوتا ہوں کہ ہماری اس جماعت میں شخصیت پرستی اور ذہنی غلامی موجود نہیں ہے۔ بلکہ ہر شخص کے اندر اچھی خاصی نقادانہ نظر موجود ہے' اور سب سے بڑھ کر آپ کی تنقیدی نگاہیں خود میرے اوپر پڑتی ہیں۔ لیکن یہ خیال رکھیے کہ جتنی کڑی تنقیدی

نگاہ آپ مجھ پر ڈالتے ہیں، اور آپ کا فرض ہے کہ ایسا کریں، اتنی ہی کڑی تنقیدی نگاہ میں بھی آپ پر ڈالتا ہوں، اور میرا بھی یہ فرض ہے کہ ایسا کروں۔

آپ سے امر کی اطاعت اور ضابطے کی پابندی اور رضاکارانہ خدمت کی ادائیگی میں جتنی کمزوری ظاہر ہوتی ہے اتنا ہی میں اپنے آپ کو بے بس پاتا ہوں اور مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں ایسی بندوقوں سے کام لے رہا ہوں جو لبلبی دبانے پر بھی فائر نہیں کرتیں۔ اور ظاہر ہے کہ ایسے ہتھیاروں کو لے کر کون ایسا نادان ہوگا جو کسی بڑے اقدام کا ارادہ کر بیٹھے۔ برعکس اس کے جب میں آپ کے اندر اطاعت اور تطوع اور باضابطگی کے اوصاف پاتا ہوں، اور یہ دیکھتا ہوں کہ ایک آواز پر آپ جمع کیے جاسکتے ہیں، ایک اشارے پر آپ حرکت کرسکتے ہیں، اور خود اپنے دل کی لگن سے آپ اس کام کو کرتے رہتے ہیں۔ جو آپ کے سپرد کیا جائے، تو میرا دل قوی اور میری ہمت بلند ہونے لگتی ہے، اور میں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ اب مجھے وہ طاقت حاصل ہورہی ہے جس سے میں اس مقصد عظیم کے لیے کچھ زیادہ کام کرسکوں۔ (روداد، سوم، ص ۱۰-۱۱)

باہمی اصلاح کا صحیح طریقہ

باہمی اصلاح کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ جس شخص کی کوئی بات آپ کو کھٹکے، یا اس سے کوئی شکایت آپ کو ہو۔ اس کے معاملے میں آپ جلدی نہ کریں، بلکہ پہلے اسے اچھی طرح سمجھنے کی کوشش کریں۔ پھر اولین فرصت میں خود اس شخص سے مل کر تخلیہ میں اس سے بات کریں۔ اس پوری مدت میں اس معاملہ کا ذکر غیرمتعلق لوگوں سے کرنا اور شخص متعلق کی غیرموجودگی میں اس کا چرچا کرنا صریحاً "غیبت ہے، جس سے قطعی اجتناب کرنا چاہیے۔

اجتماعی تنقید کا صحیح طریقہ

آپس میں ایک دوسرے کی غلطیوں اور کمزوریوں پر تنقید بھی اجتماعی اصلاح کا ایک مفید طریقہ ہے۔ مگر تنقید کے صحیح حدود اور آداب ملحوظ نہ رکھنے سے یہ سخت نقصان دہ بھی ہوسکتا ہے۔ اس لیے میں وضاحت کے ساتھ بتا دینا چاہتا ہوں کہ اس کی حدود اور آداب کیا ہیں:

۱۔ تنقید ہروقت ہر صحبت میں نہ ہو۔

۲۔ تنقید کرنے والا اللہ کو شاہد سمجھ کر پہلے خود اپنے دل کا جائزہ لے لے کہ وہ اخلاص اور خیرخواہی کے جذبے سے تنقید کررہا ہے یا اس کا محرک کوئی نفسانی جذبہ ہے۔ اگر پہلی صورت ہو تو بے شک تنقید کی جائے ورنہ زبان بند کرکے خود اپنے نفس کو اس ناپاکی سے بچانے کی فکر کرنی

چاہیے۔

۳۔ تنقید کا لہجہ اور زبان دونوں ایسے ہونے چاہئیں جن سے ہر سننے والے کو محسوس ہو کہ آپ فی الواقع اصلاح چاہتے ہیں۔

۴۔ تنقید کے لیے زبان کھولنے سے پہلے یہ اطمینان کر لیجیے کہ آپ کے اعتراض کی کوئی بنیاد واقعہ میں موجود ہے۔ بلا تحقیق کسی کے خلاف کچھ کہنا ایک گناہ ہے۔ جس سے فساد رونما ہوتا ہے۔

۵۔ جس شخص پر تنقید کی جائے اسے تحمل کے ساتھ بات سنی چاہیے۔ انصاف کے ساتھ غور کرنا چاہیے۔ جو بات حق ہو اسے سیدھی طرح مان لینا چاہیے۔ اور جو بات غلط ہو اس کی بدلائل تردید کر دینی چاہیے۔ تنقید سن کر طیش میں آجانا کبر اور غرور نفس کی علامت ہے۔

۶۔ تنقید اور جواب تنقید اور جواب الجواب کا سلسلہ بلا نہایت نہیں چلنا چاہیے' کہ وہ ایک مستقل ردوکد بن کر رہ جائے۔ بات صرف اس وقت تک ہونی چاہیے جب تک دونوں کے مختلف پہلو وضاحت کے ساتھ سامنے نہ آجائیں۔ اس کے بعد اگر معاملہ صاف نہ ہو تو گفتگو ملتوی کر دیجئے' تاکہ فریقین ٹھنڈے دل سے اپنی اپنی جگہ غور کر سکیں۔

ان حدود کو ملحوظ رکھ کر جو تنقید کی جائے وہ نہ صرف یہ کہ مفید ہے بلکہ اجتماعی زندگی کو درست رکھنے کے لیے نہایت ضروری ہے۔ اس کے بغیر کوئی تنظیم زیادہ دیر تک صحیح راستے پر گامزن نہیں رہ سکتی۔ اس تنقید سے کسی کو بھی بالاتر نہ ہونا چاہیے۔ میں اس کو جماعت کی صحت برقرار رکھنے کے لیے ناگزیر سمجھتا ہوں' اور مجھے یقین ہے کہ جس روز خدانخواستہ ہمارے یہاں اس کا دروازہ بند ہوا' اسی روز ہمارے بگاڑ کا دروازہ کھل جائے گا۔

جلد ۱۱۸ کا شمارہ نومبر' دسمبر ۱۹۹۲ء عدد ۳'۴ اکٹھا شائع کیا جا رہا ہے۔ آئندہ ترجمان القرآن کی نئی جلد کا پہلا شمارہ جنوری ۱۹۹۳ء میں شائع ہو گا۔

(ادارہ)

فہمِ قرآن: تفاسیر کی روشنی میں

اخذ و ترتیب: خرّم مراد

مشاورت

فَاعْفُ عَنْهُمْ وَ اسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَ شَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ ○ (آل عمران ۳: ۱۵۹)

سو تو ان کو معاف کر، اور ان کے واسطے بخشش مانگ، اور ان سے مشورہ لے کام میں۔ پھر جب قصد کر چکا تو اس کام کا، تو پھر بھروسا کر اللہ پر، اللہ کو محبت ہے توکل کرنے والوں سے۔ (موضح الفرقان: شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ)

ان کے قصور معاف کر دو، ان کے حق میں دعائے مغفرت کرو، اور دین کے کام میں ان کو شریک مشورہ رکھو، پھر جب تمہارا عزم کسی رائے پر مستحکم ہو جائے تو اللہ پر بھروسا کرو، اللہ کو وہ لوگ پسند ہیں جو اسی کے بھروسے پر کام کرتے ہیں (تفہیم القرآن: مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ)

وَ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (الشوریٰ ۴۲: ۳۸)

اور کام کرتے ہیں مشورے سے آپس کے۔ (موضح الفرقان، ایضاً)

اپنے معاملات آپس کے مشورے سے چلاتے ہیں (تفہیم القرآن، ایضاً)

مواہب الرحمٰن: مولانا امیر علیؒ

تجاوز کر ان سے جو انھوں نے کیا۔ اور مغفرت مانگ ان کے گناہوں کی، تاکہ میں بخش

دوں۔ اس میں کامل خلق بیان فرمایا' کہ برائی کرے تو معاف کرے' اور اس کے بدلے اور نیکی کرے۔ اور یہ آنحضرتؐ کی صفت تھی کہ اگلی کتابوں میں مذکور ہے۔ ...وہ فظ نہ ہوں گے' نہ غلیظ القلب' اور نہ بازاروں میں بک بک کرنے والے' اور نہ بدلہ دیں گے برائی کا برائی سے' بلکہ عفو کریں گے اور درگزر کریں گے۔

ان کے رائے لو' یعنی شان حرب وغیرہ میں' ان کے دلوں کی خوشی کے واسطے' اور تاکہ تیرے فعل کے مطابق سنت ہو جائے۔ نبیؐ کا خود یہ حال تھا کہ لوگوں سے بہت مشورت کرتے تھے۔ اس کی محی السنہؒ نے معالم میں اور دوسروں نے روایت کیا ہے۔ حسنؓ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے کہ اس کے رسولؐ کو ان کی مشاورت کی کچھ حاجت نہیں' لیکن چاہا کہ آپؐ کے بعد کی امت اسی طریقے پر رہے۔

ابن کثیرؒ نے ذکر کیا کہ آیا یہ امر آپؐ پر واجب تھا' یا مستحب تھا۔ اس میں فقہا کے دونوں قول موجود ہیں۔ سراج میں ذکر کیا کہ اس بات پر اجماع ہے کہ جس معاملہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی وحی آگئی' تو اس میں رسولؐ کو امت سے مشاورت کرنا روا نہیں۔ کیونکہ جب کوئی حکم منصوص ہوا تو رائے باطل ہوگئی۔

رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا' کہ آگاہ رہو' کہ اللہ تعالیٰ و اس کا رسولؐ اس [مشاورت] سے بے پروا ہیں۔ و لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کو میری امت کے واسطے رحمت کیا ہے۔ سو جس نے میری امت میں مشورت کی' اس نے راہ صواب کو گم نہ کیا۔ اور جس نے مشورت نہ کی' وہ گمراہی کو نہ چوکا۔ قرطبیؒ نے ابن عطیہؒ سے نقل کیا ہے کہ اس میں خلاف نہیں کہ جو شخص' مسلمانوں کے سرداروں میں سے' مشورت نہ لیتا ہو اس کا معزول کرنا روا ہے۔

پھر جاننا چاہیے کہ ... ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ ... یہ آیت حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کی شان میں اتری۔ یہ دونوں بزرگ حضرتؐ کے حواری' آپؐ کے وزیر اور مومنوں کے باپ تھے۔ عبدالرحمن بن غنمؓ سے روایت ہے کہ رسولؐ اللہ نے ابوبکرؓ و عمرؓ سے کہا کہ جس مشورہ میں تم دونوں اتفاق کرو میں اس میں تم سے مخالفت نہ کروں گا۔...

اس میں دلالت ہے کہ اجتہاد کرنا جائز ہے' اور بیان ہے کہ قیاس حجت ہے۔...

پھر جب تو نے عزم کرلیا اس چیز کے عمل میں لانے کا' جو بعد مشاورت کے ٹھہری ہے' تو اعتماد و بھروسہ کر اللہ تعالیٰ پر' نہ اس مشاورت پر۔ اللہ تعالیٰ دوست رکھتا ہے ایسے لوگوں کو جو توکل کرتے ہیں اللہ تعالیٰ پر ... مدارک میں کہا کہ توکل اللہ تعالیٰ پر' بھروسا کرنا اللہ تعالیٰ پر' اور

اسی کے سپرد کر دینا۔

شیخ ذوالنون مصریؒ نے فرمایا کہ خلعِ ارباب اور قطعِ اسباب۔ یعنی سوائے خدائے تعالیٰ کے، جو لوگ وسیلہ گمان کیے جاتے ہیں اور گمان و وہم ان پر بھروسہ کرتا ہے، ان کو چھوڑنا۔ اور جتنے اسباب و سامان، کہ کسی کام کے پورے ہونے میں دخل رکھنے والے شمار ہوتے ہیں، سب کی جڑ کاٹ دینا۔

حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ حضرتؐ سے عزم کے معنی پوچھے گئے۔ تو فرمایا کہ ' اہل رائے سے مشورت لے کر اس کی پیروی کرنا۔ (ابن مردویہ)

عوام یہ خیال کرتے ہیں کہ کوئی تدبیر نہ کرنا' اور نہ کسی سبب ظاہری کا مباشر ہونا' یہ توکل ہے۔ حالانکہ یہ وہم و غلط ہے' بلکہ سخت مذموم ہے۔ توکل یہی ہے کہ اللہ عز و جل نے جو امور کہ ظاہر میں اسباب مقرر فرمائے ہیں' ان کو ظاہر کے اسباب کہہ کر بجا لائے' اور یہی اعتقاد رکھے کہ ' پورا ہونا کام کا' اللہ تعالیٰ ہی کے سپرد ہے۔ یہ نہیں کہ ان اسباب کی طرف' یا اسباب کے نہ دل سے پورے کرنے کی طرف' اس طرح دل لگوے کہ ان کے نہ پورے ہونے' یا ایسی کوشش نہ کرنے سے مقصود فوت ہو جائے گا' کیونکہ یہ حماقت ہے۔

اسی واسطے فرمایا کہ مشاورت کرو' اور یہ نہ سمجھو کہ جو مشورہ میں قرار پایا ایسا مضبوط ہے کہ اس میں رائے خطا نہ ہوگی۔ نہیں' بلکہ جب اس [مشورہ] کو جاری کرو تو اللہ تعالیٰ ہی پر اعتماد کرو۔ یہاں سے معلوم ہوا کہ یہ توکل تمام' ہر ہر مسلمان بندے کی شان ہے' اور اس پر واجب ہے۔ ایسا نہیں' جیسا عوام گمان کرتے ہیں' کہ یہ تو ترک دنیا کا نام ہے' سوائے فقیروں کے کون کر سکتا ہے۔ یہ گمان غلط اور شیطانی وسوسہ ہے۔

ان کا کام ان کے درمیان مشورت ہے۔ یعنی ان کی صفت ہے کہ جہاد جنگ وغیرہ کسی کام میں کوئی اپنی رائے سے کسی طریقے پر ابرام نہیں کرتے۔ بلکہ باہم مل کر' مشورے سے' اس کام کی رائے تجویز کرتے ہیں' تاکہ جماعت کی رائے متفق ہو کر اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کریں' تاکہ وہی اپنی رحمت و فضل سے کار سازی فرماوے۔

ضحاکؒ سے روایت ہے کہ جب مدینہ کے لوگوں نے رسول اللہؐ کا ظاہر ہونا سنا' تو ابو ایوبؓ کے مکان میں جمع ہو کر باہم مشورت کی کہ اس رسولؐ پر ایمان لاویں' اور اس کی مددگاری کریں۔۔۔

شیخ ابن العربیؒ نے لکھا ہے کہ مشورہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ ہے۔ حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ کو مشورہ کرنے کا حکم دیا ہے۔ چنانچہ رسولؐ اللہ ہر امر میں صحابہؓ سے مشورہ لیتے' جہاں رائے کی ضرورت ہوتی' باوجود یکہ آپؐ تمام جہاں سے افضل ہیں۔ ... اسی طرح صحابہؓ بھی باہم مشورہ کرتے تھے۔ اور یہ متواتر معروف ہے۔

اور مشورہ کرنے میں جماعت کے درمیان باہم الفت پیدا ہوجاتی ہے۔ اور عقول کے اجتماع سے راہ صواب کھل جاتی ہے۔ اور جس قوم نے مشورہ سے کام کیا' ان کو ٹھیک راہ مل جاتی ہے۔

اور جماعت مشورت کو لازم ہے کہ احسن و افضل رائے کو دیکھتے رہیں' اور کوئی شخص اپنی رائے پر ہٹ نہ کرے۔ بلکہ افضل رائے پر متفق ہو جائیں۔ اور اسی کو اپنی رائے سمجھیں' کیونکہ درحقیقت یہ انہیں کے مشورہ سے پیدا ہوتی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ اس میں برکت عطا فرماتا ہے' جب کہ اس کی رضامندی حاصل کرنے کے واسطے کام ہو۔

حتیٰ کہ یہاں تک اپنے بندوں کی تعریف فرمائی کہ ان کا کام ان کے درمیان مشورت ہے۔ یعنی کوئی شخص ان میں اپنی رائے پر نازاں نہیں ہوتا اور نہ تکبر دکھلا کر' تنہا اپنی رائے پر جبر کرتا ہے۔ اور نہ یہ لوگ کام میں جلدی کرتے ہیں' بلکہ باہم مشورہ کرکے' نیک رائے پر متفق ہو کر' اللہ تعالیٰ پر توکل کرتے ہیں۔

بیان القرآن: مولانا اشرف علی تھانویؒ

(جب آپ نے ان کے افادہ کے لیے ان کے ساتھ برتاؤ میں سے نرمی اختیار فرمائی' تو آپ کے حکم میں جو ان سے کوتاہی ہوئی' اس کو) آپ (دل سے بھی) ان کو معاف کردیجیے۔ اور (جو کچھ ان سے خدا تعالیٰ کے حکم میں کوتاہی ہوگئی' اس میں) آپ ان کے لیے (حق تعالیٰ سے) استغفار کردیجیے۔ (گو اللہ تعالیٰ نے اس لغزش کو معاف فرما دیا ہے)' مگر آپ کا استغفار فرمانا یہ علامت ہوگی آپ کی زیادہ شفقت کی' جس سے ان کی اور زیادہ تسلی ہوگی)۔ اور (بدستور) ان سے خاص خاص باتوں میں مشورہ لیتے رہا کیجیے' (تاکہ اس سے اور دونا ان کا جی خوش ہو)۔ پھر (مشورہ لینے کے بعد) جب آپ (ایک جانب) رائے پختہ کرلیں' (خواہ وہ ان کے مشورہ کے موافق ہو یا مخالف ہو)' سو خدا تعالیٰ پر اعتماد (کرکے اس کام کو کر ڈالا) کیجیے۔ بے شک اللہ تعالیٰ ایسے اعتماد کرنے والوں سے (جو خدا تعالیٰ پر اعتماد رکھیں) محبت فرماتے ہیں۔

یہ جو کہا گیا کہ خاص خاص باتوں' مراد ان سے وہ امور ہیں جن میں آپ پر وحی نازل ہوئی ہو' ورنہ بعد وحی کے پھر مشورہ کی کوئی گنجائش نہیں۔ اور یہ جو کہا گیا کہ اس سے اور دونا ان کا جی خوش ہو' یہ اس مقام کے مناسب ایک حکمت ہے' منجملہ فوائد مشورہ کے۔ ابن جریرؒ نے اسکو قتادہؒ سے نقل کیا ہے۔ اور دوسری حکمتیں بھی ہیں۔ مثلاً یہ کہ آپ کی امت کے لیے یہ سنت قرار پاوے۔ اس کو بیہقیؒ نے حسنؒ سے نقل کیا ہے۔ ' اور اس کی تائید میں ابن عدی اور بیہقیؒ نے ابن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ و رسولؐ کو تو اس مشورہ کی حاجت نہیں' لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کو میری امت کے لیے ایک رحمت بنائی ہے۔ یا یہ کہ کسی امر میں ممکن ہے کہ مشورہ سے تقویتِ رائے کی بھی حاصل ہو جاوے۔ ...اور یہ غرضِ تقویت عدمِ حاجت الی المشورہ کے منافی نہیں' کیونکہ ممکن ہے کہ عدمِ حاجت باعتبارِ غالب کے' اور یہ تقویت باعتبار بعض احیان کے ہو۔

اور یہ جو کہا گیا کہ خواہ وہ ان کے مشورہ کے موافق ہو یا مخالف ہو' دلیل اس کی یہ ہے کہ لفظ عزم میں کوئی قید نہیں لگائی۔ اور اس سے معلوم ہوا کہ امور انتظامیہ متعلقہ بالرای و المشورہ میں کثرت رائے کا ضابطہ محض بے اصل ہے' ورنہ یہاں عزم میں یہ قید ہوتی کہ بشرطیکہ آپ کا عزم کثرت رائے کے خلاف نہ ہو۔

اور مشورہ و عزم کے بعد جو توکل کا حکم فرمایا' اس سے ثابت ہوا کہ تدبیر منافی نہیں توکل کے' کیونکہ مشورہ و عزم کا داخلِ تدبیر ہونا ظاہر ہے۔ اور جاننا چاہیے کہ یہ مرتبہ توکل کا کہ' باوجود تدبیر کے' اعتقاداً اعتماد رکھے اللہ تعالیٰ پر' یہ ہر مسلمان کے ذمہ فرض عین ہے۔ اور توکل بمعنی ترک تدبیر کے' اس میں تفصیل یہ ہے' کہ اگر وہ تدبیر دینی ہے' تو اس کا ترک مذموم۔ اور اگر دنیوی' یقینی' عادۃً' ہے' تو اس کا ترک بھی ناجائز۔ اور اگر ظنی ہے' تو قوی القلب کو جائز۔ اور اگر وہمی ہے' تو اس کا ترک مامور بہ ہے۔

معارف القرآن: مفتی محمد شفیعؒ

ارشاد و اصلاح اور تبلیغ کے آداب اس سے معلوم ہو گئے' کہ جو شخص رشد و ہدایت اور دعوت الی اللہ اور اصلاح خلق کے کام کا ارادہ کرے' اس کے لیے ضروری ہے کہ یہ صفات اپنے اندر پیدا کرے۔ کیونکہ جب اللہ تعالیٰ کے محبوب رسولؐ کی سختی برداشت نہیں ہو سکتی' تو پھر کس کی مجال ہے کہ وہ تشدد اور کج خلقی کے ساتھ خلق اللہ کو اپنے گرد جمع کر سکے' اور ان کی اصلاح کا

فرض انجام دے سکے۔

حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اگر آپؐ تند خو، سخت طبیعت ہوتے، تو لوگ آپؐ کے پاس سے منتشر ہو جاتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مرشد و مبلغ کے لیے تند خوئی سخت کلامی، زہر اور اس کے کام کو ضائع کرنے والی چیز ہے۔

اس کے بعد ارشاد فرمایا، ان سے جو خطا ہو گئی ہے اس کو آپؐ معاف فرما دیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ مصلح کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ عوام کی خطاؤں کا انتقام نہ لے، بلکہ عفو و درگزر سے کام لے، برا کہنے والوں پر مشتعل نہ ہو، ایذا دینے والوں سے نرمی کا معاملہ کرے۔

اس کے بعد ارشاد فرمایا، آپؐ ان کے لیے اللہ تعالیٰ سے بھی مغفرت طلب کریں۔ جس میں یہ ہدایت ہے کہ صرف یہی نہیں کہ خود ان کی ایذاؤں پر صبر کریں، بلکہ دل سے ان کی خیر خواہی نہ چھوڑیں، اور چونکہ سب سے بڑی خیر خواہی ان کی آخرت کی درستی ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچانے کے لیے بخشش کی دعا مانگیں۔

اس کے بعد ارشاد ہے، حسبِ سابق اپنے فیصلوں اور کاموں میں ان حضرات سے مشورہ بھی لیا کریں تاکہ ان کی پوری تسلی ہو جائے۔ اس میں اس کی طرف ہدایت فرمائی کہ جو خیر خواہی کا داعیہ ان کے لیے قلب میں ہے، عمل سے بھی اس کا اظہار کریں کہ اپنی مشاورت سے ان کو مشرف فرما دیں۔ ... مشورہ کے بارے میں قرآن کریم نے دو جگہ صریح حکم دیا ہے، ایک یہی آیت مذکورہ، دوسرے سورہ شوریٰ کی آیت جس میں سچے مسلمانوں کی صفات بیان کرتے ہوئے ایک صفت یہ بیان فرمائی ہے کہ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ، یعنی اور ان کا ہر کام آپس کے مشورہ سے ہوتا ہے۔ اور بعض جگہ ضمنی طور پر مشورہ کی ہدایت فرمائی ہے، جیسے رضاعت کے احکام میں ارشاد فرمایا: عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ، یعنی بچے کا دودھ چھڑانا ماں اور باپ دونوں کی رضا مندی اور مشورہ سے ہونا چاہیے۔ مشورہ سے متعلق چند اہم مسائل قابل غور ہیں:

پہلا مسئلہ، لفظ امر اور مشورہ کے معنی، دوسرا مسئلہ، مشورہ کی شرعی حیثیت، تیسرا مسئلہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا صحابہ کرام سے مشورہ لینے کا درجہ، چوتھا مسئلہ، حکومت اسلامی میں مشورہ کا درجہ، پانچواں مسئلہ، مشورہ میں اختلافِ رائے ہو تو فیصلہ کی صورت، چھٹا مسئلہ، ہر کام میں مکمل تدبیر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ پر توکّل۔

پہلا مسئلہ: لفظ امر اور شوریٰ کی تحقیق

لفظ امر کا اطلاق عربی زبان میں کئی معنی کے لیے ہوتا ہے۔ ایک عام معنی میں آتا ہے، جو ہر

متسم بالشان قول و فعل کو شامل ہے۔ دوسرا اطلاق بمعنی حکم اور حکومت ہے' جس پر قرآن کریم میں لفظ اولی الامر محمول ہے۔ تیسرا اطلاق حق تعالیٰ کی ایک مخصوص صفت کے لیے ہے' جس کا ذکر قرآن مجید کی بہت سی آیات میں ہے۔ مثلاً اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ' اِلَيْهِ يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ' اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ' اَمْرُهٗ اِلَى اللّٰهِ' اور محققین کے نزدیک قل الروح من امر ربی میں بھی یہی امر مراد ہے۔

اب قرآن کے ارشاد وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ اور وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ میں دونوں معنی کا احتمال ہے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ پہلے ہی معنی مراد ہیں اور دوسرے معنی بھی اس میں شامل ہیں تو یہ بھی کچھ بعید نہیں' کیونکہ حکم اور حکومت کے معاملات بھی خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ اس لیے امر کے معنی ان آیات میں ہر اس کام کے ہیں جو خاص اہمیت رکھتا ہو' خواہ حکومت سے متعلق ہو خواہ معاملات سے۔ اور لفظ شوریٰ' مشورہ' مشاورت کے معنی ہیں' کسی قابلِ غور معاملہ میں لوگوں کی رائیں حاصل کرنا۔ اس لیے وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ کے معنی یہ ہوئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا کہ آپؐ قابل غور معاملات میں' جن میں حکومت کے متعلقہ معاملات بھی شامل ہیں' صحابہ کرامؓ سے مشورہ لیا کریں' یعنی ان حضرات کی رائیں معلوم کیا کریں۔

اسی طرح سورۂ شوریٰ کی آیت وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ کے معنی یہ ہوئے کہ ہر قابلِ غور معاملہ میں جس میں کوئی اہمیت ہو' خواہ حکم و حکومت سے متعلق ہو یا دوسرے معاملات سے' ان میں سچے مسلمانوں کی عادت مستمرہ یہ ہے کہ باہم مشورہ سے کام کیا کرتے ہیں۔

دوسرا مسئلہ : مشورہ کی شرعی حیثیت

اس بارہ میں قرآنِ کریم کے ارشاداتِ مذکورہ اور احادیثِ نبویہؐ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایسے معاملہ میں جس میں رائیں مختلف ہو سکتی ہیں خواہ وہ حکم و حکومت سے متعلق ہو یا کسی دوسرے معاملہ سے' باہمی مشورہ لینا رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرامؓ کی سنت اور دنیا و آخرت میں باعث برکات ہے۔ قرآن و حدیث میں اس کی تائید آئی ہے۔ اور جن معاملات کا تعلق عوام سے ہے' جیسے معاملات حکومت' ان میں مشورہ لینا واجب ہے' (ابن کثیر)

بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص کسی کام کا ارادہ کرے' اور باہم مشورہ کرنے کے بعد اس کے کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کرے' تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو صحیح اور مفید صورت کی طرف

ہدایت مل جاتی ہے۔

اور ایک حدیث میں ہے کہ جب تمہارے حکام تم میں سے بہترین آدمی ہوں' اور تمہارے مالدار سخی ہوں' اور تمہارے معاملات آپس میں مشورہ سے طے ہوا کریں' تو زمین کے اوپر رہنا تمہارے لیے بہتر ہے۔ اور جب تمہارے حکام بدترین افراد ہوں' اور تمہارے مالدار بخیل ہوں' اور تمہارے معاملات عورتوں کے سپرد ہوں' تو زمین کے اندر دفن ہو جانا تمہارے زندہ رہنے سے بہتر ہوگا۔

مطلب یہ ہے کہ جب تم پر خواہش پرستی غالب آجائے کہ بھلے برے اور نافع و مضر سے قطع نظر کرکے محض عورت کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اپنے معاملات اس کے سپرد کردو' تو اس وقت کی زندگی سے تمہارے لیے موت بہتر ہے۔ ورنہ مشورہ میں کسی عورت کی بھی رائے لینا کوئی ممنوع نہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کے تعامل سے ثابت ہے' اور قرآن کریم میں سورۂ بقرہ کی آیت جو ابھی بیان کی گئی ہے' اس میں ارشاد ہے **عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَ تَشَاوُرٍ** یعنی بچہ کا دودھ چھڑانا باپ اور ماں کے باہمی مشورہ سے ہونا چاہیے۔ اس میں چونکہ معاملہ عورت سے متعلق ہے' اس لیے خاص طور سے عورت کے مشورہ کا پابند کیا گیا ہے۔ ۔۔

ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ' ۔۔ "جس شخص سے مشورہ طلب کیا جائے وہ امین ہے۔ اس پر لازم ہے کہ اس معاملہ میں جو کام وہ خود اپنے لیے تجویز کرتا ہے وہی رائے دوسرے کو دے۔ اس کے خلاف کرنا خیانت ہے۔" یہ حدیث طبرانی نے معجم اوسط میں بہ سند حسن حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی ہے (مظہری)

البتہ یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ مشورہ صرف انہی چیزوں میں مسنون ہے جن کے بارہ میں قرآن و حدیث کا کوئی واضح قطعی حکم موجود نہ ہو۔ ورنہ جہاں کوئی قطعی اور واضح حکم شرعی موجود ہو اس میں کسی سے مشورہ کی ضرورت نہیں' بلکہ جائز بھی نہیں' مثلاً کوئی شخص اس میں مشورہ کرے کہ نماز پڑھے یا نہیں' زکوٰۃ دے یا نہیں' حج کرے یا نہیں۔ یہ مشورہ کی چیزیں نہیں' شرعی طور پر فرض قطعی ہیں۔ البتہ اس میں مشورہ کیا جاسکتا ہے کہ حج کو اس سال کیا جائے یا آئندہ' اور پانی کے جہاز سے جائے یا ہوائی جہاز سے' اور خشکی کے راستے سے جائے یا دوسرے طریق سے۔

اسی طرح زکوٰۃ کے معاملہ میں یہ مشورہ لیا جاسکتا ہے کہ اس کو کہاں اور کن لوگوں پر خرچ کیا جائے' کیونکہ یہ سب امور' شرعاً" اختیاری ہیں۔

ایک حدیث میں خود اس کی تشریح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ' فرماتے ہیں کہ میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ آپؐ کے بعد اگر ہمیں کوئی ایسا معاملہ پیش آجائے جس کا حکم صراحتہ" قرآن میں نازل نہیں ہوا' اور آپؐ سے بھی اس کے متعلق کوئی ارشاد ہم نے نہ سنا ہو' تو ہم کیا کریں ؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ایسے کام کے لیے اپنے لوگوں میں سے عبادت گزار فقہا کو جمع کرو' اور ان کے مشورہ سے اس کا فیصلہ کرو' کسی کی تنہا رائے سے فیصلہ نہ کرو۔

اس حدیث شریف سے ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ مشورہ صرف دنیوی معاملات میں نہیں' بلکہ جن احکام شرعیہ میں قرآن و حدیث کی صریح نصوص نہ ہوں ان احکام میں بھی باہمی مشورہ مسنون ہے۔ اور دوسرے یہ بھی معلوم ہوا کہ مشورہ ایسے لوگوں سے لینا چاہیے جو موجودہ لوگوں میں تفقہ اور عبادت گزاری میں معروف ہوں (خرجہ الخطیب کذافی الروح)

نیز خطیب بغدادیؒ نے حضرت ابوہریرہؓ کی ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بھی نقل کیا ہے : ... "عقل مند آدمی سے مشورہ لو اور اس کے خلاف نہ کرو ورنہ ندامت اٹھانی ہوگی۔"

ان دونوں حدیثوں کو ملانے سے معلوم ہوا کہ مجلسِ شوریٰ کے ارکان میں دو وصف ضروری ہیں' ایک صاحب عقل و رائے ہونا' دوسرے عبادت گزار ہونا۔ جس کا حاصل ہے ذی رائے اور متقی ہونا۔ اور اگر مسئلہ شرعی ہے تو فقیہہ ہونا بھی لازم ہے۔

تیسرا مسئلہ : رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو صحابہ کرامؓ سے مشورہ لینے کا درجہ

آیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا حکم دیا گیا ہے کہ صحابہ کرامؓ سے مشورہ لیں۔ اس میں یہ اشکال ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے رسول اور صاحبِ وحی ہیں' آپؐ کو کسی سے مشورہ کی کیا حاجت ہے۔ آپؐ کو ہر چیز حق تعالیٰ کی طرف سے بذریعہ وحی معلوم ہو سکتی ہے۔ اس لیے بعض علماء نے اس حکم مشورہ کو اس پر محمول کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ مشورہ کی ضرورت تھی' نہ اس مشورہ پر آپؐ کے کسی کام کا مدار تھا' صرف صحابہ کرامؓ کے اعزاز اور دل جوئی کے لیے مشورہ کا حکم آپؐ کو دیا گیا ہے۔ لیکن امام ابوبکر جصاص نے فرمایا کہ یہ صحیح نہیں ہے' کیونکہ اگر یہ معلوم ہو کہ ہمارے مشورہ پر کوئی عمل نہیں ہوگا' اور نہ مشورہ کا کسی کام پر کوئی اثر ہے' تو پھر اس مشورہ پر کوئی دل جوئی اور اعزاز بھی نہیں رہتا۔ بلکہ حقیقت امر یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عام امور میں تو براہ راست حق

تعالیٰ کی طرف سے بذریعہ وحی ایک طریق کار متعین کر دیا جاتا ہے' مگر بمقتضائے حکمت و رحمت بعض امور کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے اور صوابدید پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ ایسے ہی امور میں مشورہ کی ضرورت ہوتی ہے' اور اسی قسم کے امور میں مشورہ لینے کا آپؐ کو حکم دیا گیا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجالس مشاورت کی تاریخ بھی یہی بتلاتی ہے۔ ...

خلاصہ یہ ہے نبوت و رسالت اور صاحب وحی ہونا کچھ مشورہ کے منافی نہیں۔ اور یہ بھی نہیں کہ یہ مشورہ نمائشی دل جوئی کے لیے ہو' اس کا اثر معاملات پر نہ ہو۔ بلکہ بہت مرتبہ مشورہ دینے والوں کی رائے کو آپؐ نے اپنی رائے کے خلاف بھی قبول فرما لیا۔ بلکہ بعض امور میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بذریعہ وحی کوئی خاص صورت متعین نہ فرمانے اور مشورہ لے کر کام کرنے میں' حکمت و مصلحت یہ بھی ہے کہ آئندہ امت کے لیے ایک سنت' رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے' جاری ہو جائے' کہ جب آپؐ کو بھی مشورہ سے استغناء نہیں تو پھر ایسا کون ہے جو استغناء کا دعویٰ کر سکے۔ اسی لیے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ میں ایسے مسائل میں مشاورت کا طریق ہمیشہ جاری رہا' جن میں کوئی نص شرعی نہ تھی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صحابہ کرامؓ کا بھی یہی معمول رہا۔ بلکہ بعد میں تو ایسے احکام شرعیہ کی دریافت کے لیے بھی مشورہ کا معمول رہا' جن میں قرآن و حدیث کا کوئی صریح فیصلہ نہ تھا' کیونکہ حضرت علیؓ کرم اللہ وجہہ کے سوال کے جواب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی طریق کار بتلایا تھا۔

چوتھا مسئلہ: حکومت اسلامی میں مشورہ کا درجہ کیا ہے

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ قرآن کریم نے دو جگہ مشورہ کا صریح حکم دیا ہے۔ ... ان دونوں جگہ پر مشورہ کے ساتھ لفظ امر مذکور ہے' اور لفظ امر کی مفصل تحقیق اوپر بیان ہو چکی ہے کہ ہر مہتم بالشان قول و فعل کو بھی کہا جاتا ہے' اور حکم اور حکومت کے لیے بھی بولا جاتا ہے۔ امر کے خواہ معنی اول مراد لیں' یا دوسرے معنی' حکومت کے معاملات میں مشورہ لینا بہر صورت ان آیات سے ضروری معلوم ہوتا ہے۔ حکم یا حکومت مراد لینے کی صورت میں تو ظاہر ہی ہے اور اگر معنی عام لیے جائیں جب بھی حکم اور حکومت کے معاملات مہتم بالشان ہونے کی حیثیت سے قابل مشورہ ٹھہریں گے۔ اس لیے امیر اسلام کے فرائض میں سے ہے کہ حکومت کے اہم معاملات میں اہل حل و عقد سے مشورہ لیا کرے۔ قرآن کی آیات مذکورہ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدینؓ کا مسلسل تعامل اس کی روشن سند ہے۔

ان دونوں آیتوں میں جس طرح معاملات حکومت میں مشورہ کی ضرورت واضح ہوئی، اسی طرح ان سے اسلام کے طرز حکومت اور آئین کے کچھ بنیادی اصول بھی سامنے آگئے، کہ اسلامی حکومت ایک شورائی حکومت ہے، جس میں امیر کا انتخاب مشورہ سے ہوتا ہے، خاندانی وراثت سے نہیں۔ آج تو اسلامی تعلیمات کی برکت سے پوری دنیا میں اس اصول کا لوہا مانا جا چکا ہے، شخصی بادشاہتیں بھی طوعاً" و کرہاً" اسی طرف آ رہی ہیں، لیکن اب سے چودہ سو برس پہلے زمانہ کی طرف مڑ کر دیکھئے جبکہ پوری دنیا پر آج کے تین بتوں کی جگہ دو بتوں کی حکومت تھی، ایک کسریٰ، دوسرا قیصر، اور ان دونوں کے آئین حکومت شخصی اور وراثتی بادشاہت ہونے میں مشترک تھے، جس میں ایک شخص واحد لاکھوں، کروڑوں انسانوں پر اپنی قابلیت و صلاحیت سے نہیں، بلکہ وراثت کے ظالمانہ اصولوں کی بنا پر، حکومت کرتا تھا، اور انسانوں کو پالتو جانوروں کا درجہ دینا بھی بادشاہی انعام سمجھا جاتا تھا، یہی نظریہ حکومت دنیا کے بیشتر حصہ پر مسلط تھا، صرف یونان میں جمہوریت کے چند دھندلے اور ناتمام نقوش پائے جاتے تھے، لیکن وہ بھی اتنے ناقص اور مدھم تھے کہ ان پر کسی مملکت کی بنیاد رکھنا مشکل تھا۔ اسی وجہ سے جمہوریت کے ان یونانی اصولوں پر کبھی کوئی مستحکم حکومت نہیں بن سکی، بلکہ وہ اصول ارسطو کے فلسفہ کی ایک شاخ بن کر رہ گئے۔ اس کے برخلاف اسلام نے حکومت میں وراثت کا غیر فطری اصول باطل کرکے، امیر مملکت کا عزل و نصب جمہور کے اختیار میں دیدیا، جس کو وہ اپنے نمائندوں اہلِ حل و عقد کے ذریعہ سے استعمال کرسکیں۔ بادشاہ پرستی کی دلدل میں پھنسی ہوئی دنیا اسلامی تعلیمات ہی کے ذریعہ اس عادلانہ اور فطری نظام سے آشنا ہوئی، اور یہی روح ہے اسی طرز حکومت کی، جس کو آج جمہوریت کا نام دیا جاتا ہے۔

لیکن موجودہ جمہوریتیں چونکہ بادشاہی ظلم و ستم کے رد عمل کے طور پر وجود میں آئیں تو وہ بھی اس بے اعتدالی کے ساتھ آئیں کہ عوام کو مطلق العنان بنا کر پورے آئین حکومت اور قانون مملکت کا ایسا آزاد مالک بنایا کہ ان کے قلب و دماغ زمین و آسمان اور تمام انسانوں کے پیدا کرنے والے خدا اور اس کی اصلی ملکیت و حکومت کے تصور سے بھی بیگانہ ہوگئے۔ اب ان کی جمہوریت خدا تعالیٰ ہی کے بخشے ہوئے عوامی اقتیار پر خدا تعالیٰ کی عائد کردہ پابندیوں کو بھی بار خاطر خلاف انصاف تصور کرنے لگیں۔

اسلامی آئین نے جس طرح خلقِ خدا کو کسریٰ و قیصر اور دوسری شخصی بادشاہتوں کے جبرو استبداد کے پنجہ سے نجات دلائی، اسی طرح ناخدا آشنا مغربی جمہوریتوں کو بھی خدا شناسی، اور خدا

پرستی کا راستہ دکھلایا' اور بتلایا کہ ملک کے حکام ہوں' یا عوام' خدا تعالیٰ کے دیے ہوئے قانون کے سب پابند ہیں۔ ان کے عوام اور عوامی اسمبلی کے اختیارات' قانون سازی' عزل و نصب خدا تعالیٰ کے مقرر کردہ حدود کے اندر ہیں۔ ان پر لازم ہے کہ امیر کے انتخاب میں اور پھر عہدوں اور منصبوں کی تقسیم میں ایک طرف قابلیت اور صلاحیت کی پوری رعایت کریں' تو دوسری طرف ان کی دیانت و امانت کو پرکھیں - اپنا امیر ایسے شخص کو منتخب کریں جو علم' تقویٰ' دیانت' امانت' صلاحیت' اور سیاسی تجربہ میں سب سے بہتر ہو۔ پھر یہ امیر منتخب بھی آزاد اور مطلق العنان نہیں' بلکہ اہل الرائے سے مشورہ لینے کا پابند رہے' قرآن کریم کی آیت مذکورہ اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدینؓ کا تعامل اس پر شاہد عدل ہیں۔ حضرت عمرؓ کا ارشاد ہے :...

"شورائیت کے بغیر خلافت نہیں ہے" (کنزالعمال بحوالہ ابن ابی شیبہ)

شورائیت اور مشورہ کو اسلامی حکومت کے لیے اساسی اور بنیادی حیثیت حاصل ہے' حتیٰ کہ اگر امیر مملکت مشورہ سے آزاد ہوجائے' یا ایسے لوگوں سے مشورہ لے جو شرعی نقطہ نظر سے مشورہ کے اہل نہ ہوں تو اس کا عزل کرنا ضروری ہے' ... ابن عطیہؒ نے فرمایا کہ شورائیت شریعت کے قواعد اور بنیادی اصولوں میں سے ہے۔ جو امیر کے اہل علم اور اہل دین سے مشورہ نہ لے' اس کا عزل کرنا واجب ہے' اور یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس میں کسی کا اختلاف نہیں"۔ (البحر المحیط لابی حیان)

مشورہ کے ضروری ہونے سے اسلامی حکومت اور اس کے باشندوں پر جو ثمرات اور برکات حاصل ہوں گے' اس کا اندازہ اس سے لگایئے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مشورہ کو رحمت سے تعبیر فرمایا۔ ابن عدی اور بیہقی نے ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کو اس مشورہ کی حاجت نہیں' لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کو میری امت کے لیے ایک رحمت بنایا ہے۔ (بیان القرآن)

مطلب یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو اپنے رسولؐ کو ہر کام بذریعہ وحی بتلا دیتا' کسی کام میں بھی مشورہ کی ضرورت نہ چھوڑتا' لیکن امت کی مصلحت اس میں تھی کہ آپؐ کے ذریعے مشورہ کی سنت جاری کرائی جائے۔ اس لیے بہت سے امور ایسے چھوڑ دیے جن میں صراحتہً کوئی وحی نازل نہیں ہوئی' ان میں آپؐ کو مشورہ لینے کی ہدایت فرمائی گئی۔

پانچواں مسئلہ : مشورہ میں اختلاف رائے ہوجائے' تو فیصلہ کی کیا صورت ہوگی ؟

مسئلہ میں اگر اختلاف رائے ہو جائے تو کیا آج کل کے پارلیمانی اصول پر اکثریت کا فیصلہ نافذ کرنے پر امیر مجبور ہوگا' یا اس کو اختیار ہوگا کہ اکثریت ہو یا اقلیت جس طرف دلائل کی قوت اور مملکت کی مصلحت زیادہ نظر آئے اس کو اختیار کرے ؟ قرآن و حدیث اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کے تعامل سے یہ امر ثابت نہیں ہوتا کہ اختلاف رائے کی صورت میں امیر اکثریت رائے کے فیصلہ کا پابند و مجبور ہے' بلکہ قرآن کریم کے بعض اشارات اور حدیث اور تعامل صحابہؓ کی تصریحات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اختلاف رائے کی صورت میں امیر اپنی صواب دید کے مطابق کسی ایک صورت کو اختیار کرسکتا ہے' خواہ اکثریت کے مطابق ہو یا اقلیت کے۔ البتہ امیر اپنا اطمینان حاصل کرنے کے لیے جس طرح دوسرے دلائل پر نظر کرے گا' اسی طرح اکثریت کا ایک چیز پر متفق ہونا بھی بعض اوقات اس کے لیے سبب اطمینان بن سکتا ہے۔

آیت مذکورہ میں غور فرمایئے۔ اس میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مشورہ کا حکم دینے کے بعد فرمایا گیا ہے فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ' یعنی مشورہ کے بعد آپؐ جب کسی جانب کو طے کرکے عزم کرلیں تو پھر اللہ پر بھروسہ کیجیے۔ اس میں عَزَمْتَ کے لفظ میں عزم' یعنی نفاذ حکم کا پختہ ارادہ' صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کیا گیا۔ عَزَمْتُمْ نہیں فرمایا جس سے عزم و تنفیذ میں صحابہؓ کی شرکت معلوم ہوتی۔ اس کے اشارہ سے ثابت ہوتا ہے کہ مشورہ لینے کے بعد نفاذ اور عزم صرف امیر کا معتبر ہے۔ حضرت عمر بن الخطابؓ بعض وقت دلائل کے لحاظ سے اگر عبداللہ بن عباسؓ کی رائے زیادہ مضبوط ہوتی تھی تو ان کی رائے پر فیصلہ نافذ فرماتے تھے' حالانکہ مجلس میں اکثر ایسے صحابہؓ موجود ہوتے تھے' جو ابن عباسؓ سے عمر اور علم اور تعداد میں زیادہ ہوتے تھے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت مرتبہ حضرات شیخین صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ کی رائے کو جمہور صحابہؓ کے مقابلہ میں ترجیح دی ہے' حتیٰ کہ یہ سمجھا جانے لگا کہ آیت مذکورہ صرف ان دونوں حضرات سے مشورہ لینے کے لیے نازل ہوئی۔ حاکم نے مستدرک میں اپنی سند کے ساتھ ابن عباسؓ سے روایت کیا ہے۔ ... کہ اس آیت میں شَاوِرْهُمْ کی ضمیر سے مراد حضرت شیخینؓ ہیں۔ کلبی کی روایت اس سے بھی زیادہ واضح ہے' ... ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ یہ آیت حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ سے مشورہ لینے کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ یہ دونوں حضرات جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خاص صحابی اور وزیر تھے' اور مسلمانوں کے مربی تھے۔ (ابن کثیر) رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ حضرات شیخینؓ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا:

"جب تم دونوں کسی رائے پر متفق ہو جاؤ تو میں تم دونوں کے خلاف نہیں کرتا"۔ یہاں یہ اشکال کیا جاسکتا ہے کہ یہ تو جمہوریت کے منافی ہے' اور شخصی حکومت کا طرز ہے' اور اس سے جمہور کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔

جواب یہ ہے کہ اسلامی آئین نے اس کی رعایت پہلے کرلی ہے' کیونکہ عوام کو یہ اختیار ہی نہیں دیا کہ جس کو چاہیں امیر بنا دیں' بلکہ ان پر لازم قرار دیا ہے کہ علم و عمل اور صلاحیت کار اور خدا ترسی اور دیانت کی رو سے جس شخص کو سب سے بہتر سمجھیں صرف اس کو امیر منتخب کریں۔ تو جس شخص کو ان اعلیٰ اوصاف اور اعلیٰ صفات کے تحت منتخب کیا گیا ہو' اس پر ایسی پابندیاں عائد کرنا جو بد دیانت اور فساق' فجار پر عائد کی جاتی ہیں' عقل و انصاف کا خون کرنا' اور کام کرنے والوں کی ہمت شکنی اور ملک و ملت کے کام میں رکاوٹ ڈالنے کے مترادف ہوگا۔

چھٹا مسئلہ : ہر کام میں مکمل تدبیر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ پر توکل کرنا

اس جگہ یہ بات بہت ہی قابل غور ہے کہ نظام حکومت اور دوسرے اہم امور میں تدبیر اور مشورہ کے احکام کے بعد یہ ہدایت دی گئی ہے کہ سب تدبیریں کرنے کے بعد بھی جب کام کرنے کا عزم کرو تو اپنی عقل و رائے اور تدبیروں پر بھروسہ نہ کرو' بلکہ بھروسہ صرف اللہ تعالیٰ پر کرو' کیونکہ یہ سب تدابیر مدبر الامور کے قبضہ قدرت میں ہیں' انسان کیا اور اس کی رائے و تدبیر کیا۔ ہر انسان اپنی عمر کے ہزاروں واقعات میں ان چیزوں کی رسوائی کا مشاہدہ کرتا رہتا ہے۔ مولانا رومیؒ نے خوب فرمایا ہے۔

خویش را دیدیم و رسوائی خویش
امتحان ما مکن اے شاہ بیش

اس جملہ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ توکل ترک اسباب اور ترک تدبیر کا نام نہیں' بلکہ اسباب قریبہ کو چھوڑ کر توکل کرنا سنت انبیاء اور تعلیم قرآن کے خلاف ہے۔ ہاں اسباب بعیدہ اور دور از کار فکروں میں پڑے رہنا' یا صرف اسباب اور تدابیر ہی کو موثر سمجھ کر مسبب الاسباب اور مدبر الامور سے غافل ہو جانا' بے شک خلاف توکل ہے۔

تدبرِ قرآن : مولانا امین احسن اصلاحی

یہاں عفو اور استغفار کی ہدایت کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت بھی ہوئی کہ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ یعنی معاملات میں ان سے مشورہ لیتے رہو۔ اس بات کے ذکر کا یہاں

ایک خاص موقع ہے، جس کو مختصرا سمجھ لینا چاہیے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم معاملاتِ دین میں کسی کے مشورے کے محتاج نہیں تھے، اس لیے کہ آپؐ ہر کام وحی الٰہی کی رہنمائی میں کرتے تھے۔ لیکن سیاسی و انتظامی معاملات میں آپؐ اپنے صحابہؓ سے برابر مشورہ کرتے رہتے تھے، اور اس طرح گویا حضورؐ نے خود اپنے طرزِ عمل سے اس شورائیت کی بنیاد ڈالی جو اسلام کے سیاسی نظام کی ایک بنیادی خصوصیت رہی ہے۔ اسی شورائیت کے پیش نظر آپؐ نے غزوۂ احد کے موقع پر بھی، جس کے اثرات و نتائج یہاں زیر بحث ہیں، صحابہؓ سے مشورہ کیا کہ دشمن کا مقابلہ شہر کے اندر سے کیا جائے یا باہر نکل کر۔ مقصود اس مشورے سے۔۔۔ یہ تھا کہ جماعت کے اندر جو کمزور لوگ ہیں وہ کھل کر سامنے آجائیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ جو کمزور اور منافق قسم کے لوگ تھے انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ شہر کے اندر محفوظ ہو کر مقابلہ کیا جائے، اور اس سے ان کا مقصود یہ تھا کہ اس طرح وہ اپنی کمزوری اور نفاق کو چھپانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ لیکن مخلصین اور جاں نثاروں کی رائے اس کے خلاف ہوئی اور یہی رائے صائب اور حضورؐ کی رائے کے مطابق تھی۔ اس وجہ سے حضورؐ نے اسی رائے پر عمل فرمایا۔ تاریخ و سیرت کی کتابوں میں یہ بات جو نقل ہوئی ہے کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے بھی یہی تھی کہ مدینہ کے اندر محصور رہ کر دشمن کا مقابلہ کیا جائے لیکن پرجوش صحابہؓ نے آپ کو نکلنے پر مجبور کردیا، یہ بالکل بے ثبوت بات ہے۔ آنحضرتؐ نے جس وقت لوگوں کے سامنے یہ مسئلہ رکھا اس کے بارے میں خود اپنی رائے ظاہر نہیں فرمائی، تاکہ ہر شخص آزادی کے ساتھ اپنی رائے ظاہر کرسکے اور مقصود اس سے لوگوں کے حوصلہ کا جائزہ لینا تھا، تاکہ جنگ سے پہلے فوج کی صحیح صحیح حالت کا اندازہ ہوجائے۔ عبداللہ بن ابی اور اس کے ساتھیوں نے شہر کے اندر سے مقابلہ پر اصرار کیا، اور جاں نثاروں نے باہر نکل کر۔ آپؐ نے اس تدبیر سے جب کمزوروں اور حوصلہ مندوں کا اندازہ فرما لیا تو گھر کے اندر داخل ہوئے اور اسلحہ پہن کر باہر تشریف لائے۔ یہ اس امر کا اظہار تھا کہ مقابلہ باہر نکل کر کرنا ہے۔ جاں نثاروں کو بطور خود یہ گمان ہوا کہ مبادا حضورؐ نے یہ رائے ان کے اصرار کی وجہ سے اختیار فرمائی ہو، اس وجہ سے انہوں نے معذرت کے ساتھ اپنی رائے واپس لینی چاہی۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا کہ نبی ہتھیار پہن کر اتارا نہیں کرتا۔ یعنی اب جب کہ عزم ہوچکا تو یہ بدل نہیں سکتا۔

منافقین کو جب اپنا مشورہ منوانے میں ناکامی ہوئی تو انہوں نے مختلف طریقوں سے اپنا غصہ نکالا۔ ایک گروہ تو یہ بہانہ بنا کر عین موقع پر فوج سے الگ ہوگیا کہ اس کے مشورے کی قدر

نہیں کی گئی۔ دوسرا گروہ جو بادلِ ناخواستہ ساتھ رہا' اس نے شکست کے بعد مسلمانوں میں یہ بددلی پھیلانا شروع کردی' کہ جنگ کا یہ نتیجہ اس وجہ سے نکلا کہ اس کے مشورے کی قدر نہیں کی گئی' اگر ان کی رائے مان لی جاتی تو یہ افتاد پیش نہ آتی۔ ظاہر ہے کہ ان تمام باتوں کا مقصود شرارت اور مسلمانوں میں بددلی پھیلانا تھا۔ لیکن اس مرحلے میں مصلحت'... یہی تھی کہ ان منافقین سے درگزر کی روش اختیار کی جائے' اور جو مجلسی اور جماعتی حقوق ان کو حاصل ہیں وہ ان کی ان غلطیوں کے باوجود بھی ابھی باقی رہیں۔ چنانچہ جس طرح حضورؐ کو ان کے لیے عفو و استغفار کی ہدایت ہوئی' اسی طرح اس بات کی بھی ہدایت ہوئی کہ جو امور مشورہ کے تحت آتے رہیں ان میں آپؐ بدستور ان سے مشورہ لیتے رہیں۔ اگرچہ ان کی کمزوری اور بدخواہی واضح ہو چکی ہے۔

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ کے بعد فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ سے یہ اشارہ بھی نکلتا ہے کہ انتظامی و سیاسی امور میں مشورے کی یہ ہدایت صاحب امر کی تقویت اور اس کے اطمینان کے پہلو سے ہے۔ مشورہ کرنا تو بہرحال ضروری ہے' لیکن مشورے کے بعد جس بات پر اس کا دل ٹھک جائے' اللہ کے بھروسے پر وہ کام اسے کر گزرنا چاہیے۔ صاحب امر کے اطمینان کے بعد یہ امر کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتا کہ جو رائے اس نے اختیار کی وہ اکثریت کی ہے یا اقلیت کی۔ نہ اکثریت فی نفسہٖ دلیلِ صحت و صواب ہے نہ اقلیت دلیلِ خطا۔ البتہ یہ بات ضرور ہے کہ اکثریت کی رائے میں فی الجملہ صحت کا گمان غالب ہے۔ اس وجہ سے فصل نزاعات میں اگر اس کو فیصلہ کن مانا جائے تو مصلحت کے پہلو سے یہ راہ مامون ہے۔ بالخصوص اس زمانے میں جب کہ اتباعِ ہوا کا زور ہے' اور اختیار و اقتدار کو حدود کے اندر استعمال کرنے والے لوگ کمتر ہی ہیں۔

مذکورہ بالا دونوں آیتوں سے مندرجہ ذیل باتیں سامنے آتی ہیں۔

ایک یہ کہ عام افراد کی طرح اربابِ اقتدار و سیاست کے لیے بھی پسندیدہ روش نرمی و چشم پوشی ہی کی روش ہے۔ اسی سے افراد میں حسن ظن اور اعتماد پیدا ہوتا ہے جس سے اجتماعی نظام میں وحدت' قوت اور استحکام کی برکتیں ظہور میں آتی ہیں۔ سختی اور سخت گیری اس کی فطرت میں نہیں بلکہ اس کے عوارض میں سے ہے۔ جس طرح صحت کے لیے اصل شے غذا ہے لیکن کبھی کبھی کسی مرض کے علاج کے لیے دوا کی بھی ضرورت پیش آجاتی ہے اسی طرح اجتماعی نظام میں اصل چیز نرمی ہے۔ سختی کبھی کبھی ضرورت کے تحت اختیار کرنی پڑتی ہے۔

دوسری یہ کہ اجتماعی نظام میں شورائیت اس حسن ظن و اعتماد کا مظہر ہے جو راعی اور رعایا اور امیر و مامور میں ہونا چاہیے۔ اسی سے استبداد اور سخت دلی کی جڑ کٹتی ہے اور راعی اور رعایا

دونوں طرف سے وہ تعاون ظہور میں آتا ہے جو استحکام کی بنیاد ہے۔

تیسری یہ کہ توکل' بے عملی اور تعطل کا کوئی بہانہ اور گوشہ خمول کا کوئی تکیہ نہیں ہے بلکہ انفرادی و اجتماعی زندگی کی تمام سرگرمیوں میں عزم و عمل کی بنیاد ہے۔

چوتھی یہ کہ اصل قوت توکل علی اللہ ہے۔ وسائل و اسباب کی حیثیت ثانوی ہے۔

پانچویں یہ کہ توکل ایمان کا لازمی تقاضا ہے۔ جو شخص خدا پر ایمان کا مدعی ہے لیکن اس کو خدا پر بھروسہ نہیں ہے اس کا ایمان بے معنی ہے۔

شوریٰ' مصدر ہے' "فتیا" کے وزن پر اور اس کے معنی آپس میں مشورہ کرنے کے ہیں۔ لفظ "امر" عربی میں ہمارے لفظ "معاملہ" کی طرح بہت وسیع معنوں میں آتا ہے۔ اس کے صحیح مفہوم کا تعین موقع و محل اور سیاق و سباق سے کرتے ہیں۔ یہاں قرینہ پتہ دے رہا ہے کہ یہ لفظ جماعتی نظم کے مفہوم میں آیا ہے۔ یعنی مسلمانوں کا جماعتی اور سیاسی نظم' خود سری' انانیت' خاندانی برتری' نسبی غرور پر مبنی نہیں ہے بلکہ اہل ایمان کے باہمی مشورہ پر مبنی ہے۔...

ایک سوال یہاں قابل غور ہے کہ قرآن کا معروف اسلوبِ بیان تو یہ ہے کہ وہ نماز کے ساتھ بالعموم زکوٰۃ یا انفاق کا ذکر کرتا ہے' لیکن یہاں اس معروف طریقہ کے خلاف نماز اور انفاق کے بیچ میں شوریٰ کا ذکر آگیا ہے۔ آخر شوریٰ کی اہمیت کا وہ خاص پہلو کیا ہے جس کی بنا پر اس کو نماز کے پہلو میں جگہ دی گئی؟

ہمارے نزدیک اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اسلام کے نظمِ اجتماعی کی روح اور اس کے قالب کی اصلی شکل نماز میں محفوظ کی گئی ہے۔ اسی کے اندر مسلمانوں کو دکھایا گیا ہے کہ کس طرح ان کو اللہ کی بندگی کے لیے ایک بنیانِ مرصوص بن کر کھڑے ہونا ہے' کس طرح اپنے اندر سے سب سے زیادہ علم و تقویٰ والے کو اپنی امامت کے لیے منتخب کرنا ہے' کس طرح لوگوں کو حدود الٰہی کے اندر اس امام کی بے چون و چرا اطاعت کرنی ہے' اور کس طرح امام اس بات کا پابند ہے کہ لوگوں کو کسی ایسی بات کا حکم نہ دے جو اللہ اور رسولؐ کے کسی حکم کے خلاف ہو اور کس طرح اس کے ایک ادنیٰ مقتدی کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ اگر وہ کوئی غلطی کرے تو وہ اس کو ٹوک دے' یہاں تک کہ عین نماز کے اندر بھی رکوع' سجود' قیام' قعود یا تلاوت میں کوئی ادنیٰ فروگزاشت بھی اس سے صادر ہو جائے تو اس کے پیچھے ہر نماز پڑھنے والا اس کو متنبہ کرنے کا ذمہ دار ہے اور امام کا یہ فرض ہے کہ اگر مقتدی کی تنبیہہ مطابق شریعت ہے تو وہ اس کو قبول [کرے۔]

اور اپنی غلطی کی فوراً اصلاح کرے۔ گویا اس طرح ہمارا پورا نظم اجتماعی نماز کی صورت میں متشکل کرکے ہمیں یہ دکھایا گیا کہ ہم اپنی سیاسی تنظیم میں اسی نمونہ کی پیروی کریں۔ اسی طرح اللہ کے دین کی اقامت کے لیے اپنی تنظیم کریں' اسی طرح اپنے اندر سے سب سے زیادہ اہل اور صاحب علم و تقویٰ کو اپنی قیادت کے لیے منتخب کریں۔ اسی طرح تمام معروف میں بے چون و چرا اس کی اطاعت کریں' اور اگر اس سے کوئی ایسی بات صادر ہو جو شریعت کے معروف کے خلاف ہو تو بے خوف لومتہ لائم اس کو متنبہ کرکے اس کو صحیح راہ پر لانے کی کوشش کریں۔

نماز اور ہمارے سیاسی نظام کا یہ تعلق ہے جس کے سبب سے قرآن نے ٹھیک اس وقت جب مسلمان ایک ہیئت اجتماعی کی شکل اختیار کرنے والے تھے' ان کی رہنمائی شوریٰ کی طرف فرمائی۔ اور اس شوریٰ کا ذکر نماز کے پہلو بہ پہلو کرکے ایک طرف تو اس کی عظمت نمایاں فرمائی کہ دین میں اس کا کیا درجہ و مرتبہ ہے' اور دوسری طرف اس کی تشکیل کی نوعیت بھی واضح فرما دی کہ اس میں امیر و مامور کے حقوق و فرائض کی صورت کیا ہوگی' کس طرح کے لوگ اس کی رکنیت کے لیے موزوں ہوں گے' جماعت اور خلق خدا سے متعلق ان پر کیا ذمہ داریاں عائد ہوں گی اور ان کی اصلی مسئولیت کس کے آگے ہوگی۔

شوریٰ کی اہمیت اور نماز کے ساتھ اس کے تعلق کا یہی پہلو تھا کہ عہد رسالتؐ اور خلفائے راشدینؓ کے دور میں اس کا انعقاد مسجد ہی میں ہوتا تھا۔ خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروقؓ کے متعلق تو سیرت کی کتابوں میں یہ روایت بھی ملتی ہے کہ وہ شوریٰ کے انعقاد کا اعلان **"الصلوٰۃ جامعۃ"** کے الفاظ سے کراتے تھے۔ یعنی اہلِ شوریٰ نماز کے لیے جمع ہوں۔ جب اہلِ شوریٰ مسجد میں جمع ہو جاتے تو وہ دو رکعت نماز ادا کرتے۔ ظاہر ہے کہ جب وہ نماز پڑھتے تھے تو دوسرے اہلِ شوریٰ بھی ان کی اقتداء میں نماز پڑھتے رہے ہوں گے۔ نماز اور دعا کے بعد حضرت عمرؓ مسئلہ زیرِ بحث پیش کرتے' اور اہل شوریٰ اس پر اپنی رایوں کا اظہار کرتے' اور خلیفہ کی رہنمائی میں کسی متفق علیہ نتیجہ تک پہنچنے کی کوشش کرتے۔

یہ طریقہ اللہ تعالیٰ کی رہنمائی کے حصول کے پہلو سے بھی نہایت بابرکت ہے' اور اسلام کے نظم سیاسی کی اصل روح کے تحفظ کے نقطہ نظر سے بھی۔ لیکن اس دور میں مسلمانوں نے دوسری قوموں کی تقلید میں شورائی نظام کی جگہ' نظام بھی دوسرے اختیار کرلیے' اور مسجدوں سے بھی ان کا تعلق بالکل منقطع ہوگیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ خدا کی رہنمائی سے محروم ہوگئے اور ان کی باگ شیطان اور اس کے ایجنٹوں کے ہاتھ میں چلی گئی۔ اب پارلیمنٹوں کے ایوانوں میں جو دھینگا

مشتق ہوتی ہے اس کی مثال بازاروں میں بھی مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔

فی ظلال القرآن: سیّد قطب شہیدؒ

"ان سے معاملات میں مشورہ کرو!" ان قطعی و حتمی الفاظ کے ساتھ حکومت کے نظام کے سلسلے میں اسلام شوریٰ کے اصول کو مقرر کرتا ہے، یہاں تک کہ خود محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اس پر عمل کرنا ہے۔ یہ ایک قطعی نص ہے، جس کے بعد امت کے لیے اس معاملہ میں شک و شبہہ کی گنجائش نہیں رہتی کہ شوریٰ اسلام کا بنیادی اصول ہے اور اسلامی نظام اس کے سوا کسی بنیاد پر قائم نہیں ہو سکتا۔ البتہ شوریٰ کی شکل اور وہ طریقہ جس کے ذریعہ شوریٰ متحقق ہو، اس میں امت کے حالات اور اس کی زندگی کے طور و طریق کے لحاظ سے تغیر و تبدل کی گنجائش ہے۔ ہر وہ شکل اور ہر وہ طریقہ، جس کے ذریعہ شوریٰ کی حقیقت ---- نہ کہ اس کی ظاہری شکل ---- متحقق ہو، شوریٰ ہے اور اسلام کا جز ہے۔

یہ قطعی حکم اس وقت آیا جبکہ اس سے قبل بظاہر شوریٰ کے خطرناک اور تلخ نتائج سامنے آچکے تھے۔ کیونکہ بظاہر اسی کے اجراء سے مسلمانوں کی صفوف کی وحدت میں اختلال رونما ہوا تھا۔ مشرکین سے جنگ کے سلسلے میں مسلمانوں کی آراء مختلف تھیں۔۔۔اس اختلاف کے باعث ہی مسلمانوں کی وحدت میں انتشار پیدا ہوا، چنانچہ عبداللہ بن ابی بن سلول، تہائی لشکر کو لے کر واپس چلا گیا، جبکہ دشمن دروازے پر موجود تھا۔ یہ ایک بہت بڑا حادثہ اور خطرناک انتشار و اختلال تھا۔ اسی طرح یہ بات بھی ظاہر ہوئی کہ باہر نکل کر جنگ کرنے کی پالیسی فوجی نقطہ نظر سے زیادہ محفوظ پالیسی نہ تھی، کیونکہ یہ مدینہ کے دفاع کے سلسلے میں ---- جیسا کہ عبداللہ بن ابی نے کہا ---- پچھلی پالیسیوں کے خلاف تھی۔ خود مسلمانوں نے اس جنگ کے بعد ہونے والے غزوۂ احزاب میں اس کے خلاف پالیسی اختیار کی۔ وہ مدینہ ہی میں رہے، مدینہ کے آس پاس خندق قائم کی اور دشمن سے جنگ کرنے کے لیے باہر نہ نکلے، اور اس طرح انہوں نے غزوۂ احد کے سبق سے فائدہ اٹھایا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس بات سے بے خبر نہ تھے کہ باہر نکلنے کے فیصلہ پر عمل درآمد کے نتیجہ میں مسلمانوں کو خطرناک نتائج سے دوچار ہونا پڑے گا۔ آپؐ نے ایک خواب بھی دیکھا تھا۔ جو سچا خواب تھا اور جس کی صداقت کو آپ خود محسوس فرما رہے تھے۔ اس خواب کی تعبیر آپؐ نے یہ دی تھی کہ آپؐ کے گھر کے لوگوں میں سے کوئی شخص اور آپؐ کے ساتھیوں

میں بہت سے لوگ شہید ہوں گے' اور محفوظ اور مضبوط زرہ کی تعبیر آپؐ نے مدینہ منورہ سے کی۔ آپؐ کو یقیناً اس بات کا حق تھا کہ مشورے کے نتیجہ میں لوگ جس فیصلہ پر پہنچے تھے' آپؐ اسے رد کردیں۔ لیکن آپؐ نے یہ جاننے کے باوجود کہ اس فیصلے پر عمل درآمد کے نتیجے میں مصائب و آلام' نقصانات اور قربانیوں سے دو چار ہونا پڑے گا' شوریٰ سے حاصل ہونے والے فیصلے کو نافذ فرما دیا۔ کیونکہ شوریٰ کے اصول کا استقرار اور امت کی تعلیم و تربیت کا کام وقتی نقصانات سے بڑھ کر ہے!

نبوی قیادت کو اس بات کا حق تھا کہ نازک ترین حالات میں مسلمانوں کی صف میں انتشار کے برپا ہونے اور جنگ کے تلخ ترین نتائج کے سامنے آجانے کی وجہ سے آپؐ جنگ کے بعد شوریٰ کے اصول کو اٹھا کر پھینک دیتے۔ لیکن اسلام تو ایک امت کو وجود میں لا رہا تھا۔ اس کی تربیت کر رہا تھا اور اسے انسانیت کی قیادت کے لیے تیار کر رہا تھا۔ اللہ کو اس بات کا علم تھا کہ امتوں کی تربیت اور قیادت راشدہ کے لیے انہیں تیار کرنے کا بہترین راستہ یہ ہے کہ شوریٰ کے ذریعہ ان کی تربیت کی جائے اور حالات کے نتائج کو برداشت کرنے کی ان میں صلاحیت پیدا کی جائے۔ اور یہ کہ امت غلطی کرے ـــــ خواہ غلطی کتنی ہی بڑی ہو اور کتنے ہی تلخ نتائج کی حامل ہو ـــــ تاکہ وہ یہ جانے کہ وہ اپنی غلطیوں کی اصلاح کیسے کرے' اور اپنے رائے اور عمل کے نتائج کو کس طرح انگیز کرے۔ کیونکہ غلطیوں کا ارتکاب نہ ہو تو صحیح روش کا علم نہیں ہوسکتا۔ نقصانات کی کوئی اہمیت نہیں جبکہ ان کے نتیجہ میں ایک ایسی امت وجود میں آئے جو تربیت یافتہ' علم و ادراک کی حامل اور نتائج کا صحیح اندازہ کرنے والی ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ امت کی زندگی میں غلطیوں' لغزشوں اور نقصانات کے کم ہونے سے امت کو کچھ حاصل ہونے والا نہیں' جبکہ اس کا نتیجہ یہ ہو کہ امت اس بچے کی طرح ہوجائے جو لاڈ پیار کے ساتھ پالا جا رہا ہو۔ اس صورت میں امت مادی نقصانات سے بھی دو چار ہوسکتی ہے اور مادی منافع بھی حاصل کرسکتی ہے' لیکن اسے اپنی ذات' اپنے وجود' اپنی اصلاح اور عملی زندگی کے سلسلے میں اپنی تعلیم و تربیت کا عظیم نقصان ہوگا' اس بچے کی طرح جو مثلاً چلنے سے اس لیے روک دیا جاتا ہے کہ وہ بہت زیادہ پھسلتا اور گرتا ہے۔

اسلام ایک امت کو وجود میں لا رہا تھا اور اس کی تربیت کر رہا تھا۔ ناگزیر تھا کہ امت کو درجۂ بلوغ عطا کیا جائے' اور اس کی عملی زندگی کی حرکت کے سلسلے میں اس پر سے نگرانی اور کارجیں شپ کو اٹھا لیا جائے' تاکہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی و سرپرستی میں زندگی

کے عملی مسائل کے لیے تیار ہو سکے۔ اگر قیادت راشدہ کی موجودگی کے باعث شوریٰ کی اور نازک ترین حالات میں امت کی عملی تربیت کی ضرورت نہ رہتی، اور وہ اس کے لیے مانع بنتی ـــــ جیسا کہ احد کا معرکہ تھا، جو بالآخر امتِ مسلمہ کے انجام کا فیصلہ کرنے والا تھا اور امتِ مسلمہ ایک نو تشکیل امت تھی جو ہر جانب سے دشمنوں میں گھری ہوئی تھی ـــــ اگر ان حالات میں اور ان خطرات کی موجودگی میں قیادت کے لیے جائز ہوتا کہ وہ مشورے کے بغیر صرف اپنی رائے سے فیصلہ کرتی، بہ الفاظِ دیگر قیادتِ راشدہ کا امت میں وجود کافی ہوتا، اور پر خطر حالات میں شوریٰ کا قائم مقام بن سکتا، تو یقیناً محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود، جبکہ ان کے ساتھ وحی الٰہی کی طاقت بھی تھی، امت مسلمہ کو اس زمانے میں شوریٰ کے حق سے محروم کرنے کے لیے کافی ہوتا، خصوصاً" ان تلخ نتائج کی روشنی میں، جو شوریٰ کے بعد سامنے آئے، اور امت مسلمہ کے وجود کے لیے پر خطر حالات کے موجب بنے۔ لیکن حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود سے ـــــ جبکہ ان کے ساتھ وحی الٰہی کی طاقت بھی تھی ـــــ اور ان حوادث اور ان حالات کے وقوع پذیر ہونے سے شوریٰ کا حق ختم نہیں ہوا، کیونکہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ جانتا تھا کہ نازک ترین حالات میں بھی شوریٰ ضروری ہے، خواہ نتائج کچھ نکلیں، نقصانات کتنے ہی ہوں، مسلمانوں کی صف میں کتنا ہی انتشار رونما ہو، کتنی ہی تلخ قربانیاں دینی پڑیں اور کتنے ہی خطرات کے بادل منڈلا رہے ہوں! کیونکہ یہ سب جزئی باتیں ہیں، جن کا اس بات کے مقابلے میں کوئی وزن نہیں کہ امتِ راشدہ وجود میں لائی جائے، جس کی، زندگی کے مسائل کے سلسلے میں عملی تربیت ہو، جو رائے اور عمل کی ذمہ داریوں کا ادراک کرنے والی اور رائے اور عمل کے نتائج کو ذہن میں محفوظ رکھنے والی ہو، چنانچہ خاص اسی زمانے میں یہ خدائی حکم نازل ہوا، کہ ... "تو انہیں معاف کردو۔ (خدا سے) ان کے لیے مغفرت کی دعا مانگو اور معاملات میں ان سے مشورہ کیا کرو۔"

یہ اس لیے کہ یہ اصول خطرناک ترین حالات میں بھی، جو اس اصول کے استعمال کے نتیجہ میں رونما ہوں، قائم و برقرار رہے، اور اس لیے بھی کہ یہ اصول امت مسلمہ کی زندگی میں اچھی طرح پیوست ہو جائے خواہ اس کی تطبیق کے دوران کتنے ہی خطرات رونما ہوں، اور تاکہ امت مسلمہ کی زندگی میں اس اصول کی اہمیت کو رد کرنے کی کمزور اور لچر دلیل بھی ختم ہو جائے، جو اس وقت پیش کی جانے لگے جبکہ امت اس اصول کے استعمال سے بعض بظاہر خراب نتائج سے دو چار ہو، خواہ یہ مسلمانوں کی صف میں انتشار رونما ہونے کا ـــــ جیسا کہ غزوہ احد کے موقع پر ہوا، جبکہ دشمن دروازے پر تھا ـــــ سبب کیوں نہ ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ امتِ راشدہ کا

وجود اسی اصول کا مرہون منت ہے اور امتِ راشدہ کا وجود ہر خطرے سے' جو اس راستہ میں پیش آئے' بڑھ کر ہے۔

لیکن اسلامی نظام کی حقیقی صورت مکمل طور پر اسی وقت سامنے آئے گی جبکہ ہم آیت کے باقی حصے کو بھی پیش نظر رکھیں۔ آیت کے اس حصے سے معلوم ہوتا ہے کہ شوریٰ کے بعد کبھی بھی تذبذب اور تعویق کی روش اختیار نہیں کرنی چاہیے۔

اسی طرح شوریٰ توکل علی اللہ سے مرد مومن کو بے نیاز نہیں کردیتی۔...

شوریٰ کا مقصد یہ ہے کہ مختلف رایوں پر غور و خوض کرکے صحیح رائے اور صحیح رخ کا انتخاب کیا جائے۔ جب بات یہاں تک پہنچ جائے تو شوریٰ کا رول ختم ہو جاتا ہے اور تنفیذ کا رول شروع ہوتا ہے۔ عزم و جزم کے ساتھ' اللہ پر بھروسہ کرتے ہوئے فیصلے کی تنفیذ! اس طرح معاملہ اللہ کی قضا و قدر سے مربوط ہوجاتا ہے کہ اب اس کی مشیت جس طرح کے نتائج سے چاہے' دو چار کرے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو جس طرح شوریٰ کی' اور خطرناک ترین حالت میں بھی رائے کے اظہار اور پھر فیصلے کے نتائج کو انگیز کرنے کی تعلیم دی' اسی طرح آپؐ نے یہ سبق بھی دیا کہ شوریٰ کے بعد فیصلے کو نافذ کیا جائے' اللہ پر بھروسہ کیا جائے اور اپنے آپ کو اللہ کی قضا و قدر کے ——— یہ جاننے کے باوجود کہ اس کا رخ کیا ہے ——— حوالے کردیا جائے۔ چنانچہ آپؐ نے جنگ کے لیے نکلنے کے فیصلہ کو نافذ فرمایا۔ آپؐ اپنے گھر میں داخل ہوئے' زرہ پہنی اور ہتھیار لگائے ——— حالانکہ آپؐ کو معلوم تھا کہ آپؐ کہاں جا رہے ہیں اور مصائب و آلام اور قربانیوں سے آپؐ اور صحابہ کرامؓ دو چار ہونے والے ہیں ——— اور حالانکہ آپؐ کو اس فیصلے کے ٹالنے کا ایک موقع مل گیا تھا' کیونکہ جن لوگوں نے نکلنے کے لیے جوش و خروش کا مظاہرہ کیا تھا' اب وہ تردد و تذبذب کا شکار تھے' انھیں یہ اندیشہ ہوگیا تھا کہ انھوں نے آپؐ کی رائے کے خلاف آپؐ کو عمل کرنے پر مجبور کردیا ہے' انھوں نے معاملہ آپؐ پر چھوڑ دیا کہ آپؐ چاہیں تو مدینہ سے نکلیں اور چاہیں تو مدینہ میں رہ کر مقابلہ کریں' لیکن آپؐ نے فیصلے سے ہٹنے کے اس موقع سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ آپؐ چاہتے تھے کہ انھیں پورا سبق دیں' شوریٰ کا سبق' پھر شوریٰ کے بعد عزم کرنے اور اللہ پر بھروسہ کرنے اور اپنے آپ کو اس کی قضا و قدر کے حوالے کرتے ہوئے' فیصلے کو نافذ کرنے کا سبق! آپ نے انھیں اس بات کی تعلیم دی کہ شوریٰ کے لیے ایک وقت ہے' لیکن شوریٰ ہوچکنے کے بعد تردد' تذبذب' اور از سرنو رایوں کو الٹنے پلٹنے کا کوئی موقع

نہیں، کیونکہ اس کا نتیجہ بے عملی، سلبیت و منفیت اور نہ ختم ہونے والے تذبذب کی صورت میں برآمد ہوگا۔ راستہ ایک ہی ہے: مشورہ اور غور و خوض، پھر عزم، فیصلے کا نفاذ اور توکل علی اللہ، جسے اللہ محبوب رکھتا ہے۔...

جس خصلت کو اور جس کے حامل افراد کو اللہ محبوب رکھے، اس خصلت کے اختیار کرنے کے لیے اہل ایمان کو حریص ہونا ہی چاہیے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہی وہ خصلت ہے، جو اہل ایمان کو اہل کفر سے ممتاز کرتی ہے۔ اللہ پر بھروسہ کرنا اور معاملات کو بالآخر اللہ کے حوالے کرنا اسلامی تصور اور اسلامی زندگی میں توازن کی راہ ہے۔ یہ کائنات کی اس عظیم حقیقت کے ساتھ تعامل کی روش ہے کہ تمام معاملات کا مرجع اللہ کی ذات گرامی ہے اور وہ جو کچھ چاہتا ہے، اسے بہرحال کر ڈالتا ہے۔

تفہیم القرآن: مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ

[شوریٰ] کو یہاں اہل ایمان کی بہترین صفات میں شمار کیا گیا ہے، اور سورۂ آل عمران (آیت ۱۵۹) میں اس کا حکم دیا گیا ہے۔ اس بنا پر مشاورت اسلامی طرز زندگی کا ایک اہم ستون ہے، اور مشورے کے بغیر اجتماعی کام چلانا نہ صرف جاہلیت کا طریقہ ہے بلکہ اللہ کے مقرر کیے ہوئے ضابطے کی صریح خلاف ورزی ہے۔ مشاورت کو اسلام میں یہ اہمیت کیوں دی گئی ہے؟ اس کے وجوہ پر اگر غور کیا جائے تو تین باتیں واضح طور پر ہمارے سامنے آتی ہیں۔

ایک یہ کہ جس معاملے کا تعلق دو یا زائد آدمیوں کے مفاد سے ہو، اس میں کسی ایک شخص کا اپنی رائے سے فیصلہ کر ڈالنا اور دوسرے متعلق اشخاص کو نظر انداز کر دینا زیادتی ہے۔ مشترک معاملات میں کسی کو اپنی من مانی چلانے کا حق نہیں ہے۔ انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ ایک معاملہ جتنے لوگوں کے مفاد سے تعلق رکھتا ہو اس میں ان سب کی رائے لی جائے، اور اگر وہ کسی بہت بڑی تعداد سے متعلق ہو تو ان کے معتمد علیہ نمائندوں کو شریک مشورہ کیا جائے۔

دوسرے یہ کہ انسان مشترک معاملات میں اپنی من مانی چلانے کی کوشش یا تو اس وجہ سے کرتا ہے کہ وہ اپنی ذاتی اغراض کے لیے دوسروں کا حق مارنا چاہتا ہے، یا پھر اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو بڑی چیز اور دوسروں کو حقیر سمجھتا ہے۔ اخلاقی حیثیت سے یہ دونوں صفات یکساں قبیح ہیں، اور مومن کے اندر ان میں سے کسی صفت کا شائبہ بھی نہیں پایا جا سکتا۔ مومن نہ خود غرض ہوتا ہے کہ دوسروں کے حقوق پر دست درازی کر کے خود ناجائز فائدہ اٹھانا چاہے، اور نہ

وہ متکبر اور خود پسند ہوتا ہے کہ اپنے آپ ہی کو عقل کل اور علیم و خبیر سمجھے۔

تیسرے یہ کہ جن معاملات کا تعلق دوسروں کے حقوق اور مفاد سے ہو ان میں فیصلہ کرنا ایک بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ کوئی شخص جو خدا سے ڈرتا ہو اور یہ جانتا ہو کہ اس کی کتنی سخت جواب دہی اسے اپنے رب کے سامنے کرنی پڑے گی، کبھی اس بھاری بوجھ کو تنہا اپنے سر لینے کی جرات نہیں کر سکتا۔ اس طرح کی جراتیں صرف وہی لوگ کرتے ہیں جو خدا سے بے خوف اور آخرت سے بے فکر ہوتے ہیں۔ خدا ترس اور آخرت کی بازپرس کا احساس رکھنے والا آدمی تو لازماً یہ کوشش کرے گا کہ ایک مشترک معاملہ جن جن سے بھی متعلق ہو ان سب کو، یا ان کے بھروسے کے نمائندوں کو اس کا فیصلہ کرنے میں شریک مشورہ کرے، تاکہ زیادہ سے زیادہ صحیح اور بے لاگ اور مبنی برانصاف فیصلہ کیا جاسکے، اور اگر نادانستہ کوئی غلطی ہو بھی جائے تو تنہا کسی ایک ہی شخص پر اس کی ذمہ داری نہ آپڑے۔

یہ تین وجوہ ایسے ہیں جن پر اگر آدمی غور کرے تو اس کی سمجھ میں یہ بات اچھی طرح آسکتی ہے کہ اسلام جس اخلاق کی انسان کو تعلیم دیتا ہے، مشورہ اس کا لازمی تقاضا ہے اور اس سے انحراف ایک بہت بڑی بد اخلاقی ہے جس کی اسلام کبھی اجازت نہیں دے سکتا۔ اسلامی طرز زندگی یہ چاہتا ہے کہ مشاورت کا اصول ہر چھوٹے بڑے اجتماعی معاملے میں برتا جائے۔ گھر کے معاملات ہوں تو ان میں میاں اور بیوی باہم مشورے سے کام کریں، اور بچے جب جوان ہو جائیں تو انھیں بھی شریک مشورہ کیا جائے۔ خاندان کے معاملات ہوں تو ان میں کنبے کے سب عاقل و بالغ افراد کی رائے لی جائے۔ ایک قبیلے یا برادری یا بستی کے معاملات ہوں اور سب لوگوں کا شریک مشورہ ہونا ممکن نہ ہو، تو ان کا فیصلہ کوئی مقامی پنچایت یا مجلس کرے جس میں کسی متفق علیہ طریقے کے مطابق تمام لوگوں کے معتمد علیہ نمائندے شریک ہوں۔ ایک پوری قوم کے معاملات ہوں تو ان کے چلانے کے لیے قوم کا سربراہ سب کی مرضی سے مقرر کیا جائے، اور وہ قومی معاملات کو ایسے صاحب رائے لوگوں کے مشورے سے چلائے جن کو قوم قابل اعتماد سمجھتی ہو، اور وہ اسی وقت تک سربراہ رہے جب تک قوم خود اسے اپنا سربراہ بنائے رکھنا چاہے۔ کوئی ایماندار آدمی زبردستی قوم کا سربراہ بننے اور بنے رہنے کی خواہش یا کوشش نہیں کر سکتا، نہ یہ فریب کاری کر سکتا ہے کہ پہلے بزور قوم کے سر پر مسلط ہو جائے اور پھر جبر کے تحت لوگوں کی رضامندی طلب کرے، اور نہ اس طرح کی چالیں چل سکتا ہے کہ اس کو مشورہ دینے کے لیے لوگ، بجائے آزادانہ مرضی سے اپنی پسند کے نمائندے چنیں، بلکہ وہ نمائندے منتخب کریں جو اس کی مرضی کے مطابق رائے دینے

والے ہوں۔ ایسی ہر خواہش صرف اس نفس میں پیدا ہوتی ہے جو نیت کی خرابی سے ملوث ہو' اور اس خواہش کے ساتھ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ کی ظاہری شکل بنانے اور اس کی حقیقت غائب کردینے کی کوششیں صرف وہی شخص کرسکتا ہے جسے خدا اور خلق دونوں کو دھوکا دینے میں کوئی باک نہ ہو' حالانکہ نہ خدا دھوکا کھاسکتا ہے' اور نہ خلق ہی اتنی اندھی ہوسکتی ہے کہ کوئی شخص دن کی روشنی میں علانیہ ڈاکہ مار رہا ہو اور وہ سچے دل سے یہ سمجھتی رہے کہ وہ ڈاکہ نہیں مار رہا ہے بلکہ لوگوں کی خدمت کر رہا ہے۔

اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ کا قاعدہ خود اپنی نوعیت اور فطرت کے لحاظ سے پانچ باتوں کا تقاضا کرتا ہے:

اوّل یہ کہ اجتماعی معاملات جن لوگوں کے حقوق اور مفاد سے تعلق رکھتے ہیں انہیں اظہار رائے کی پوری آزادی حاصل ہو' اور وہ اس بات سے پوری طرح باخبر رکھے جائیں کہ ان کے معاملات فی الواقع کس طرح چلائے جا رہے ہیں' اور انہیں اس امر کا بھی حق حاصل ہو کہ اگر وہ اپنے معاملات کی سربراہی میں کوئی غلطی یا خامی یا کوتاہی دیکھیں تو اس پر ٹوک سکیں' احتجاج کرسکیں' اور اصلاح ہوتی نہ دیکھیں تو سربراہ کاروں کو بدل سکیں۔ لوگوں کا منہ بند کرکے اور ان کے ہاتھ پاؤں کس کر ان کو بے خبر رکھ کر ان کے اجتماعی معاملات چلانا صریح بددیانتی ہے جسے کوئی شخص بھی اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ کے اصول کی پیروی نہیں مان سکتا۔

دوم یہ کہ اجتماعی معاملات کو چلانے کی ذمہ داری جس شخص پر بھی ڈالنی ہو اسے لوگوں کی رضا مندی سے مقرر کیا جائے' اور یہ رضا مندی ان کی آزادانہ رضا مندی ہو۔ جبر اور تخویف سے حاصل کی ہوئی' یا تحریص و اطماع سے خریدی ہوئی' یا دھوکے اور فریب اور مکاریوں سے کھسوٹی ہوئی رضا مندی درحقیقت رضا مندی نہیں ہے۔ ایک قوم کا صحیح سربراہ وہ نہیں ہوتا۔ جو ہر ممکن طریقہ سے کوشش کرکے اس کا سربراہ بنے' بلکہ وہ ہوتا ہے جس کو لوگ اپنی خوشی اور پسند سے اپنا سربراہ بنائیں۔

سوم یہ کہ سربراہ کار کو مشورہ دینے کے لیے بھی وہ لوگ مقرر کیے جائیں جن کو قوم کا اعتماد حاصل ہو' اور ظاہر بات ہے کہ ایسے لوگ کبھی صحیح معنوں میں حقیقی اعتماد کے حامل قرار نہیں دیے جاسکتے جو دباؤ ڈال کر' یا مال سے خرید کر' یا جھوٹ اور مکر سے کام لے کر' یا لوگوں کو گمراہ کرکے نمائندگی کا مقام حاصل کریں۔

چہارم یہ کہ مشورہ دینے والے اپنے علم اور ایمان و ضمیر کے مطابق رائے دیں' اور اس

طرح کے اظہار رائے کی انھیں پوری آزادی حاصل ہو۔ یہ بات جہاں نہ ہو' جہاں مشورہ دینے والے کسی لالچ یا خوف کی بنا پر' یا کسی جتھہ بندی میں کسے ہوئے ہونے کی وجہ سے خود اپنے علم اور ضمیر کے خلاف رائے دیں' وہاں درحقیقت خیانت اور غداری ہوگی نہ کہ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ کی پیروی۔

پنجم یہ کہ جو مشورہ اہل شوریٰ کے اجماع (اتفاق رائے) سے دیا جائے' یا جسے ان کے جمہور (اکثریت) کی تائید حاصل ہو' اسے تسلیم کیا جائے۔ کیونکہ اگر ایک شخص یا ایک ٹولہ سب کی سننے کے بعد اپنی من مانی کرنے کا مختار ہو تو مشاورت بالکل بے معنی ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ یہ نہیں فرما رہا ہے کہ "ان کے معاملات میں ان سے مشورہ لیا جاتا ہے" بلکہ یہ فرما رہا ہے کہ "ان کے معاملات آپس کے مشورے سے چلتے ہیں۔" اس ارشاد کی تعمیل محض مشورہ لینے سے نہیں ہوجاتی' بلکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ مشاورت میں اجماع یا اکثریت کے ساتھ جو بات طے ہو اسی کے مطابق معاملات چلیں۔

اسلام کے اصول شوریٰ کی اس توضیح کے ساتھ یہ بنیادی بات بھی نگاہ میں رہنی چاہیے کہ یہ شوریٰ مسلمانوں کے معاملات کو چلانے میں مطلق العنان اور مختار کل نہیں ہے بلکہ لازماً اس دین کے حدود سے محدود ہے جو اللہ تعالیٰ نے خود اپنی تشریع سے مقرر فرمایا ہے' اور اس اصل الاصول کی پابند ہے کہ "تمہارے درمیان جس معاملہ میں بھی اختلاف ہو اس کا فیصلہ کرنا اللہ کا کام ہے" اور "تمہارے درمیان جو نزاع بھی ہو اس میں اللہ اور رسولؐ کی طرف رجوع کرو۔" اس قاعدہ کلیہ کے لحاظ سے مسلمان شرعی معاملات میں اس امر پر تو مشورہ کرسکتے ہیں کہ کسی نص کا صحیح مفہوم کیا ہے' اور اس پر عمل در آمد کس طریقہ سے کیا جائے تاکہ اس کا منشا ٹھیک طور سے پورا ہو' لیکن اس غرض سے کوئی مشورہ نہیں کرسکتے کہ جس معاملہ کا فیصلہ اللہ اور اس کے رسولؐ نے کردیا ہو اس میں وہ خود کوئی آزادانہ فیصلہ کریں۔

اسلامی نظمِ جماعت

نعیم صدیقی

کسی بڑی مہم میں کوئی بھی جماعت اگر اس حالت میں شریک ہو کہ اس کا نظم ڈھیلا ہو تو اس کو اس موٹر گاڑی کا سا انجام پیش آسکتا ہے جس کے پرزے اپنی اپنی جگہ پر ٹھیک کسے ہوئے نہ ہوں اور ڈرائیور اسے پہاڑی اور ریگستانی راستوں پر ایک لمبا سفر طے کرنے کے لیے لے کر نکلے' اور پھر سفر میں جانے کے بعد قدم قدم پر اسے مشکلات کا سامنا ہو' یہاں تک کہ گاڑی کی مشین کسی نازک مرحلے پر بالکل ہی جواب دے دے۔

نظمِ جماعت بلاشبہ ہر جماعت کے لیے ایک طبعی ضرورت کی حیثیت رکھتا ہے' لیکن ہماری نگاہ میں طبعی ضرورت کے علاوہ اس کی حیثیت عین دین و اخلاق کی اور اللہ کی عبادت کی اور رسول کریم علیہ التحیہ والسلام کی اطاعت کی ہے' اس وجہ سے دوسروں کے ہاں نظم کی کمزوری صرف اس لیے ناگوار ہوتی ہے کہ وہ کام میں حائل ہوتی ہے' لیکن ہمارے لیے تو وہ ایسی معصیت ہے جو عاقبت کو خراب کردینے والی ہے۔ پس نظمِ جماعت کو کسے رکھنا اور اس کے لیے ہر رفیق کا پاسبان بن کے کھڑے رہنا ضروری ہے۔

نظمِ جماعت کے سلسلے میں چند اہم امور کا تذکرہ کردینا مناسب ہوگا :

اربابِ امر کی اطاعت

۱۔ نظمِ جماعت کی ریڑھ کی ہڈی' امر و اطاعت کا توازن ہے۔ یہ توازن برقرار نہ رہے تو پھر نظمِ جماعت کے سرے سے کوئی معنی نہیں رہتے۔ یہی وجہ ہے کہ اس امر و اطاعت کے توازن کو درہم برہم کردینا گناہ کبیرہ ہے' جو عین خدا و رسولؐ کی نافرمانی ہے اور جس کے بعد دنیا و آخرت کی فلاح حاصل نہیں ہوسکتی۔

قرآن کا مطالبہ یہ ہے:

اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ (النساء ۴: ۵۹)

اللہ کی اطاعت کرو' اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور تم (اللہ اور رسول کی اطاعت کرنے والوں) میں سے جو لوگ اولی الامر قرار پائیں' ان کی اطاعت کرو۔

واضح رہے کہ یہ تینوں اطاعتیں واجب ہیں' اور ان میں سے کسی ایک کا ترک' ایک مسلم کو خسران کے مقام پر لے آتا ہے۔ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

من اطاعنی فقد اطاع اللہ ومن عصانی فقد عصی اللہ ومن اطاع امیری فقد اطاعنی ومن عصی امیری فقد عصانی (بخاری و مسلم)

جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی' اور جس نے میرے (یعنی آنحضورؐ کے مقرر کردہ یا آنحضورؐ کی پیروی کرنے والے) امیر کی اطاعت کی' اس نے میری اطاعت کی اور جس نے میرے امیر کی نافرمانی کی' اس نے میری نافرمانی کی۔

حضرت ابوہریرہؓ کا ایک قول جو اسی مدعا کی وضاحت کرتا ہے 'عقد الفرید میں یوں درج ہے:

ان طاعتہم لا نعمتہ من طاعتہ اللہ وعصیانہم من عصیان اللہ

بلاشبہ آئمہ کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے اور ان کی نافرمانی اللہ کی نافرمانی ہے۔

بے شمار احادیث و روایات' جو اس سلسلے میں قطعی الاحکام ہیں' کتب احادیث میں مذکور ہیں۔ ان سب کا مدعا ہے کہ اسلامی ریاست کو چلانے کے لیے یا اقامتِ دین کی جدوجہد کے لیے جو نظمِ جماعت اسلامی آئین و حدود پر قائم ہو' اس میں جو لوگ اسلامی معیارِ قیادت کے پیش نظر اپنے علم و تقویٰ میں ارفع ہونے کی بنا پر امارت کے لیے منتخب کیے گئے ہوں' ان کی اطاعت (فی المعروف) کرنا اہم ترین شرعی فرائض و واجبات میں شامل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبیؐ نے صاف صاف فرمایا کہ اگر نکٹا حبشی بھی امارت کے مقام پر سرفراز ہو تو باوجودیکہ اس کی شکل و صورت' اس کا نسلی و نسبی مقام' تمدنی آداب و رسوم میں اس کا ذوق' جذبات اور حسیات میں اس کا مخصوص رجحان کسی کو چاہے کتنا ہی ناپسند کیوں نہ ہو' اس کی پوری پوری اطاعت کرنا ضروری ہے۔ نبی صلعم نے یہ بھی واضح فرمادیا کہ اس مطالبۂ اطاعتِ امیر سے جو لوگ روگردانی کریں' ان کے تقویٰ کی بڑی سے بڑی مقدار بھی انہیں آخرت کی کامرانی سے ہمکنار نہ کرسکے گی۔

من خلع یداً من طاعتہ لقی اللہ یوم القیامتہ لا حجتہ لہٗ (صحیح مسلم)

جس کسی نے اطاعتِ امر سے اپنا ہاتھ چھڑالیا وہ قیامت کے روز اللہ سے اس حال میں ملاقات کرے گا کہ (اپنے آپ کو برسرحق ثابت کرنے کے لیے) اس کے پاس کوئی دلیل نہ ہوگی۔

ان اشارات سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اسلامی نظامِ جماعت میں نظامِ امارت کی حیثیت وہ نہیں جو عام دنیا پرست سیاسی جماعتوں کے صدروں، نائب صدروں، صوبائی اور ضلعی ناظمین اور ان کے مشیروں کی ہوتی ہے۔ بلکہ اسلامی نظامِ امارت میں امیر، نائب امرا، صوبائی ضلعی اور مقامی امرا، دوسرے ناظمینِ شعبہ جات اور ان کے ارکانِ شوریٰ کا مقام ایک خاص طرح کا شرعی اور دینی مقام ہوتا ہے، جس کے حقوق و واجبات بھی شرعی اور دینی ہیں، نہ کہ مصلحتی۔ ان وجوہ سے اسلامی نظامِ امارت کی اطاعت کا معاملہ ویسا نہیں ہے جیسا سیاسی پارٹیوں میں ہوتا ہے۔

جب تک اسلامی نظامِ جماعت کے اربابِ امر، کتاب و سنت سے کھلا کھلا انحراف نہ کریں، ان کے احکام اور ان کی ہدایات سے سرتابی کرنا، یا ان کی اطاعت بہ طوع و رغبت کرنے کے بجائے بددلی کے ساتھ کرنا، یا ان کے لیے خیر خواہانہ جذبات رکھنے کے بجائے کینہ و نفرت کے جذبات دلوں میں رکھنا، ان کے خلاف سازشیں کرنا، ان کی غیبت کرنا، ان کے متعلق بددلی پھیلانا، ان کو واقعات و احوال سے آگاہ کرنے میں اور راہ صواب پر چلنے کے لیے صحیح مشورے دینے میں بخل دکھانا، اور ان کے سوچے ہوئے رازوں کو نشر کرنا، یہ سب کچھ کبیرہ گناہوں میں داخل ہے۔ اور یہ ایسے کبائر ہیں کہ ان کی وجہ سے عبادت کی انجام دہی اور عام اخلاق کی درستی کے باوجود آدمی کی عاقبت تباہ ہوسکتی ہے۔ اس وجہ سے اسلامی نظامِ جماعت کے اندر چلنے والوں کو طاعتِ امرا کے معاملے میں بہت محتاط ہونا چاہیے۔

اربابِ امر پر تنقید اور اس کی حدود

اسلام نے اندھی اطاعت کا مطالبہ یقیناً نہیں کیا ہے، بلکہ وہ صرف "اطاعت فی المعروف" چاہتا ہے۔ معروف کی حدود سے باہر اس کا حکم "لَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ" کا ہے۔ اسلامی نظام جماعت اس کا مقتضی ہے کہ اس کے سارے ارکان امرا کی روش پر کڑی نگاہ رکھیں اور انھیں معروف کی حدود سے کوئی قدم نہ نکالنے دیں، جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ، نے فرمایا تھا:

یا ایھا الناس! من رأی منکم فی اعوجاجا فلیقومہ

اے لوگو! تم میں سے جو کوئی میرے رویے میں کوئی کجی دیکھے تو اس کا فرض ہے کہ وہ میری اس کجی کو سیدھا کردے۔

اس سلسلے میں کسی امرِ اجتہاد میں اگر اختلاف ہو تو اسے صاف کرنے کے لیے اسے پیش کرنے کا' اس پر بحث کرنے کا' اور اگر صاف نہ ہوسکے تو اس پر قائم رہنے کا حق بھی جماعتِ اسلامی کے ارکان کو از روئے شریعت حاصل ہے' لیکن اطاعت بہرحال اسی فیصلے کی کرنی لازم ہے جو اربابِ امر کی طرف سے نافذ العمل ہو۔ طاعت کا قلادہ گردن سے نکالنے کے لیے یہ دلیل کافی نہیں ہے کہ فیصلہ میری رائے کے خلاف کیوں ہوا' اور حالات کو اس نظر سے نہیں دیکھا گیا کہ جس نظر سے میں دیکھتا ہوں۔ طاعت کا قلادہ صرف اسی صورت میں نکالا جاسکتا ہے جب کہ بالفاظ رسالتمابؐ "ان تروا کفراً بواحاً" اسلام سے کھلا کھلا انحراف پایا جائے۔

امرا کو راہ حق پر سیدھا رکھنے کے لیے تنقید بھی مامورین کا ایک بنیادی حق ہے' لیکن اسلامی نظام جماعت میں تنقید اس سوئے ظن کے ساتھ کرنا جو سیاسی جماعتوں کا خاصہ ہے' غیر اسلامی طریق کار ہے۔ اسلامی نظام میں تنقید حسن ظن کے ساتھ ہوتی ہے' اور اس میں اعتراض اور شکایت کے انداز کی بجائے خیر خواہانہ مشورہ کی روح کارفرما ہوتی ہے۔ اسلامی جماعت میں تنقید کا صرف وہی پاکیزہ اسلوب کھپ سکتا ہے کہ جس میں نہ ناقد کے اندر تلخ جذبات کام کررہے ہوں اور نہ مخاطب میں اس سے کراہت پیدا ہو' وہ کہ جس میں کوئی انتقامی اسپرٹ شامل نہ ہو' اور وہ کہ جس میں اپنی بات منوانے کی ضد کا اثر نہ ہو' اور وہ کہ جس کے قبول نہ کیے جانے پر آدمی پر بددلی کا دورہ نہ پڑجائے۔ پھر اسلامی تنقید کی شان یہ ہے کہ وہ رو در رو ہوتی ہے' نہ کہ پس پشت۔ پس پشت اگر کچھ کہا جائے تو وہ غیبت ہے' نہ کہ تنقید' غیبت اسلامی نظام سے پرلے درجے کی بدخواہی ہے' حالانکہ تنقید اس کی بہترین خیر خواہی ہے' ان دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

اسلامی نظام جماعت میں امرا پر جتنے زیادہ اور صاف سے صاف الفاظ میں تنقید کی جائے' اتنا ہی جماعت کے حق میں رحمت ہوتا ہے۔ لیکن یہ بہرحال حفظ مراتب کے اسلامی اخلاق کے خلاف ہے کہ امرا پر طنز و تعریض کے چبھتے ہوئے فقرے کسے جائیں' ان کے لیے احترام سے ہٹے ہوئے فقرے استعمال کرکے دلوں کا بخار نکالا جائے' ان کا مذاق اڑایا جائے' یا ان کی کمزوریوں کا ذکر کر کرکے مزے لیے جائیں۔

حق تنقید کا یہ استعمال بھی مفسدہ انگیز ہوتا ہے کہ اس پر قانونی بندشیں نہ ہونے کی وجہ سے

اسے مستقل پیشہ بنا لیا جائے' اور اہلِ امر کی ہر حرکت' ہر عمل اور ہر فیصلے پر' بلکہ ان کے ایک ایک فقرے پر جا و بے جا گرفت کرنے کا سلسلہ شروع ہو جائے' اور ان سے ہر امر کے متعلق مطالبہ کیا جائے کہ اس کے پورے پورے دلائل بیان کرو۔ یہ حالت اگر پیدا ہو جائے تو امارت کی ذمہ داری کو لے کر کوئی انسان بھی ایک دن نہیں چل سکتا۔ پھر تو زمام امر ہاتھ میں لینے والے کا کام یہی رہ جائے گا کہ وہ مامورین کے سامنے بیٹھا جواب دہی کرتا رہے اور ان کے اعتماد کو بحال کرنے کے لیے اپنے ایک ایک جملے اور ایک ایک فعل کا تفصیلی تجزیہ کر کے سمجھاتا رہے کہ اس میں کوئی قابل شکایت چیز نہیں ہے۔

ان سطور کے پیش نظر اگر سوچا جائے تو اندازہ ہوگا کہ امرا کے مقابلے میں حق نصح یا حق تنقید استعمال کرتے ہوئے صراط مستقیم پر چلنا بہت ہی احتیاط کا تقاضا کرتا ہے۔ اس احتیاط کے تقاضے سے اگر صرف نظر کر لیا جائے تو آدمی تنقید کا حق غلط اسلوب سے استعمال کرتے ہوئے نظام جماعت کے لیے ایک خطرناک روگ بن سکتا ہے' اور خود اس کی عاقبت خطرے میں پڑ سکتی ہے۔

غلط تنقید کی ایک بڑی علامت یہ ہے کہ وہ طاعت میں حائل ہو جاتی ہے' اور ایک مخلص نظام امارت کے حقوق میں کھلی کھلی خیانت کرنے پر اتر آتا ہے۔ پس طاعت اپنی جگہ پر' اور تنقید اپنی جگہ پر رہنی چاہیے' طاعت کو ختم کرنے والی چیز معصیت خالق کے ظہور کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتی۔

اربابِ امر کی شخصیات اور ان کی تبدیلی

نظامِ طاعت کی پابندی میں شخصیتوں کے ادل بدل سے کوئی فرق نہیں لایا جا سکتا۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ایک جماعت کے وسیع نظامِ امارت کا بار اٹھانے والی ایک بڑی ٹیم کے افراد میں سے کوئی اونچا ہو' کوئی نیچا' کسی کا علم زیادہ ہو' کسی کا تقویٰ' کسی کو دورِ جدید کے خاص تقاضوں پر زیادہ دسترس ہو اور کسی کو قرونِ اولیٰ کے شئون کی گہری بصیرت حاصل ہو' کسی کی نگاہ احکامِ شریعت کے ظاہر پر زیادہ رہتی ہو اور کوئی احکام کی حکمتوں کا لحاظ رکھنے میں خاص توجہ دے' کسی کے نزدیک تحریک کا ایک پہلو زیادہ اہمیت رکھتا ہو' کسی کے نزدیک' دوسرا پہلو اولین توجہ چاہتا ہو۔ پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی کا مزاج ذرا سخت ہو کسی کا نرم' کوئی زیادہ بے تکلفی کو پسند کرتا ہو کوئی باوقار مسلک کا خوگر ہو' کوئی گرمیِ گفتار کو پسند کرے اور کوئی خاموشی سے کام کرنے والا ہو۔ پھر لباس' وضع قطع' نشست و برخواست' کھانے پینے وغیرہ وظائفِ زندگی میں مختلف افراد کے ذوق

مختلف ہوسکتے ہیں۔ شخصی ذوق، رجحان اور طبیعت کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں جو ایک نظامِ جماعت کی مجموعی پالیسی کی وحدت کے باوجود اپنا کام ایک خاص حد تک کرتے ہیں۔ ان فروق و اختلافات کی وجہ سے مختلف اہلِ امر کی حیثیتیں مختلف نہیں ہوجاتیں کہ ہر ایک کے حقوقِ طاعت میں کمی بیشی کی جاسکے، اور اگر ان میں ادل بدل ہوجائے تو لوگ اس امر کی جستجو کریں کہ فلاں میں وہ ذوق اور وہ اطوار کیوں نہیں ہیں جو فلاں میں ہیں؛ اور جب ایک قسم کے طرزِ عمل سے مانوس ہوجانے کے بعد کوئی ادل بدل واقع ہو تو طبائع میں اضطراب نمودار ہو اور حرکت و عمل کی رفتار سست پڑنے لگے۔ اسی مفسدے کے سدباب کے لیے نبی صلعم نے یہ ہدایت دی تھی کہ ایک نکٹا حبشی بھی اگر کسی امر میں تمہارا امام ہو تو "فَاسْمَعُوْا وَاَطِیْعُوْا" پر عمل کرو، اور یہ نہ دیکھو کہ اس کی صورت کیسی ہے اور اس کا لباس کیسا ہے، اور اس کے ذوق اور آداب و شعائر کس طرح کے ہیں۔ طاعت کو شریعت نے اس امر پر منحصر نہیں کیا ہے کہ اہلِ امر کا شخصی ذوق و رجحان ہر پہلو سے مامورین کی منشا کے مطابق ہو۔

اسلامی تحریک شخصیتوں کے محور پر نہیں گھومتی بلکہ ایک وقت میں اگر نبیؐ کی رہنمائی میں چلتی ہے، تو دوسرے وقت حضرت صدیقؓ "**وما محمد الا رسول قد خلت من قبله الرسل، افان مات او قتل انقلبتم علی اعقابکم**" کے کلمات بلند کرتے ہوئے آتے ہیں اور تحریک کی باگ دوڑ سنبھال لیتے ہیں اور آپ کے بعد حضرت عمرؓ جیسا سخت مزاج خلیفہ اس کی عنانِ قیادت تھامتا ہے۔ پھر حضرت عثمانؓ جیسی حلیم ہستی اس ذمہ داری کو اپنے کندھوں پر لیتی ہے۔ اور پھر حضرت علیؓ اپنی خصوصیات کے ساتھ اس کی سربراہ کاری کرتے ہیں ——— اس سارے ادل بدل میں نظامِ اطاعت کی فرضیت بحال رہتی ہے، اور اسے توڑنا ایک ہی طرح کا گناہ کبیرہ رہتا ہے۔

اس بات کو کبھی نہ بھولیے کہ ہمیں مرکزی، صوبائی، ضلعی اور مقامی امارت کی اطاعت، شخصیتوں کے پیشِ نظر نہیں بلکہ ان مناصب کی شرعی حیثیت کے پیشِ نظر، کرنے پر مامور کیا گیا ہے۔ پس شخصیتیں حالات و ضروریات کے ماتحت چاہے روزانہ بدلتی رہیں، لیکن خدا اور رسولؐ نے امارت کے جو حقوق ہمارے اوپر واجب ٹھہرائے ہیں ان کی ادائی پوری دیانتداری کے ساتھ یکساں جاری رہنی چاہیے۔

اہلِ امر کی ذمہ داریاں

اب تک مامورین کی ذمہ داریاں بیان کی گئی ہیں۔ ان کے مقابل دوسری طرف اہلِ امر کی

ذمہ داریاں ان سے بھی زیادہ نازک ہیں۔ جب تک اہلِ امر اپنے حصے کی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کا اہتمام نہ کریں نظام امر و اطاعت کا توازن برقرار نہیں رہ سکتا۔ مامورین کے مقابلے میں اہلِ امر کی اُخروی باز پرس بھی زیادہ شدید قسم کی ہوگی' اور دنیا میں تحریکِ اسلامی کی کامیابی کا زیادہ دار و مدار بھی ان کی صحتِ کار پر ہوتا ہے۔ خود مامورین' اطاعت پر صحیح معنوں میں اسی صورت میں قائم رہ سکتے ہیں' جب اہلِ امر اپنے حصے کے فرض ---- یعنی امر ---- کے معاملے میں اپنے فرائض کو ٹھیک ٹھیک ادا کریں۔

اس سلسلے میں ذیل کی آیت بہترین رہنمائی کرتی ہے' جس میں اللہ تعالیٰ نے نبیؐ کی شانِ امارت کو ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَا نْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ (آل عمران ۳: ۱۵۹)

یہ کچھ اللہ ہی کی مہربانی ہے کہ آپؐ ان (مسلمانوں) کے لیے نرم خو ہیں اور اگر آپؐ درشت کلام اور تلخ مزاج ہوتے تو یہ آپؐ کے آس پاس سے منتشر ہو جاتے' پس ان کی غلطیوں سے درگزر کیجیے' ان کے لیے بخشش طلب کیجیے' اور معاملات میں ان سے مشورے لیجیے' پھر جب آپؐ (مشورے کے بعد) کسی بات کا تہیہ کرلیں تو اس کے بعد اللہ پر بھروسہ کریں۔ یقیناً اللہ (اپنے اوپر) بھروسہ کرنے والوں کو محبوب رکھتا ہے۔

اس آیت میں نبیؐ کی پیروی میں کام کرنے والے ان تمام اہلِ امر کے لیے وہ بنیادی ہدایت دے دی گئی ہے جس کو ملحوظ رکھے بغیر اسلامی جماعت کا نظام خوبی سے کام نہیں کرسکتا۔ اسلامی امارت کے ہر فرد کو اس آیت کی روشنی میں جن امور کا پابند رہنا چاہیے اور جن کے مطابق اپنے مزاج کو ڈھالنا چاہیے وہ یہ ہیں:

۱- نرم خوئی:

کوئی امارت اپنا صحیح وظیفہ کامیابی سے سرانجام نہیں دے سکتی' جب تک کہ اس میں بلا امتیاز جملہ رفقائے جماعت کے لیے لینت' شفقت اور نرم خوئی کا وصف موجود نہ ہو۔ اسلامی نظام امارت کے ارکان کا رویہ ایسی جماعت گیر شفقت پر مشتمل ہونا چاہیے کہ ہر فرد یہ محسوس کرے کہ سب سے زیادہ قرب اور سب سے زیادہ اعتماد شاید مجھی کو حاصل ہے۔ کسی شخص کو اپنے دل کی بات کہنے میں جھجک نہ ہو' کسی کو حلقۂ اہلِ امر میں داخل ہوتے ہوئے کوئی ذہنی احساس مانع نہ

ہو' اور کسی فرد کو کوئی اونچ نیچ محسوس نہ ہو۔ یہ چیز جہاں نہیں ہوتی وہاں اہلِ امر اور مامورین میں ذہنی' قلبی اور مجلسی بعد پیدا ہوتا جاتا ہے' اور رفاقت کی روح میں کمزوری آنے لگتی ہے۔ یہی حقیقت تھی جسے علامہ اقبالؒ نے یوں بیان کیا تھا۔

کوئی کارواں سے ٹوٹا کوئی بدگماں حرم سے
کہ میرِ کارواں میں نہیں خوئے دلنوازی

بس یہی خوئے دلنوازی ہے جس کا مطالبہ یہ آیت کرتی ہے۔

خوئے دلنوازی کے اس مطالبے سے یہ مراد لینا ایک زیادتی ہوگی کہ امیر کسی معاملے میں سختی نہ کریں' کسی کوتاہی پر باز پرس نہ کریں' کسی نازیبا حرکت پر ٹوکتے نہ پائیں' اور ایک ایک رکنِ جماعت کی خوشامد کرتے پھریں۔ بخلاف اس کے حکمت و مصلحت کے مطابق جہاں شدت و غلظت سے کام لینے کے مواقع آئیں' وہاں سختی کرنے کا تلخ فرض ادا کرنے میں کوتاہی کرنا جماعت کے مفاد کے خلاف ہوگا' امارت کو اصول' مقصد اور نظم کی پاسبانی میں رفقا سے بسا اوقات تحکم کا رویہ اختیار کرنا پڑتا ہے' لیکن اس کی رُوح رحمت و شفقت کی روح ہوتی ہے' اگرچہ اس کا ظاہری پیرایہ سخت گیرانہ ہوتا ہے۔

ب - عفوودرگزر:

اہلِ امر کو چونکہ تمام رفقا کی حرکات و سکنات کا جائزہ لینے کا موقع ملتا ہے' اور اس وجہ سے ان کے بہت سے عیوب' بہت سی کمزوریاں' بہت سی غلط کاریاں اہل امر کے سامنے آتی رہتی ہیں ---- کسی نے اپنی ڈیوٹی کی انجام دہی میں کوتاہی کردی' کسی نے مخالفینِ تحریک سے کوئی نازیبا بات کہہ دی' کسی نے کوئی غلط جذباتی مظاہرہ کردیا' کسی نے کوئی اہم راز کی بات بر سرعام کہہ دی' کسی نے اپنے کسی رفیق سے یا کسی غیر سے بد معاملگی کردی' کسی نے غیبت کی' کسی نے شکایت کی ---- اور ان حالات میں انسانی طبیعت بدگمانی اور تکدر کا اثر قبول کیے بغیر نہیں رہ سکتی۔ آہستہ آہستہ اس قسم کی کمزوریوں کو دیکھ دیکھ کر اہلِ امر کے دل' خاص خاص افراد کے متعلق بھی' اپنے پورے حلقے کے متعلق بھی تلخی سے بھرنے لگتے ہیں' اور ایک طرح کی کراہت شدت و غلظت کے روپ میں ربط ضبط اور طرز کلام میں ظاہر ہونے لگتی ہے اور اس سے دل پھٹتے ہیں' بدگمانیاں بڑھتی ہیں' اور نظام امر و طاعت کے پیچ ڈھیلے ہونے لگتے ہیں۔ مذکورہ بالا آیت اسی معاملے میں انتباہ کرتی ہے' اور اہلِ امر کو وہ یہ درس دیتی ہے کہ وہ اپنے رفقا کی کمزوریوں کو دیکھیں اور ان کو معاف کرتے جائیں' اور دل میں کسی طرح کی گرہ نہ پڑنے دیں' اور اپنے اندر

مایوسی اور تکدر کو داخل نہ ہونے دیں۔ کیونکہ مختلف طبائع مختلف کمزوریاں رکھتی ہیں اور بہت محنت کے بعد آہستہ آہستہ ان کی اصلاح ہوا کرتی ہے۔ صرف یہی نہیں کہ اپنی طرف سے عفو ودرگزر سے کام لیا جائے' بلکہ شفقت کا تقاضا یہ ہے کہ ان کی غیرحاضری میں اپنے اللہ سے ان کے لیے دعائے مغفرت کی جائے۔ یہ باہمی محبت کے جوڑ کو مضبوط کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔

ج- مشاورت:

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ کا اقتضا یہ ہے کہ اہلِ امر موقع بہ موقع اپنے مختلف رفقا سے ان کی حیثیتوں اور ان کے علم و بصیرت کے مطابق مشورہ طلب کرتے رہیں۔ باہمی مشاورت سے اعتماد بڑھتا ہے' بدگمانیاں دور ہوتی ہیں' اور فیصلوں پر عمل کرنے میں سہولت ہوتی ہے۔

مشورت یقیناً فرض ہے اور جس معاملے میں بھی' جو رفقا صحیح مشورہ دینے کے اہل ہوں ان سے استصواب کرنا عین ارشاد الٰہی کا اتباع ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر معاملے میں ہر شخص سے لازماً مشورہ لیا جائے' بلکہ ضروری یہ ہے کہ جس معاملے میں جس کا مشورہ لینا مناسب ہو اس سے ضرور مشورہ طلب کیا جائے۔ بعض صورتوں میں خاص اشخاص سے' بعض میں جماعت کی منتخب کردہ شوریٰ سے' اور بعض میں عام ارکان اور رفقا سے' حسبِ مصلحت جماعت مختلف معاملات میں رائے طلب کرنا' اور پھر آرا پر غوروخوض کرنا' اقامت دین کی جدوجہد کے لیے قوت بخش ہے' نیز اس سے نظام جماعت مستحکم رہتا ہے۔ مشاورت اس بات کا بھی بہترین وسیلہ ہے کہ اس کے ذریعے مختلف ذہن اور دماغ باہم ہم آہنگی پیدا کرتے ہیں' اور پیش نظر معاملات میں ہونے والے فیصلوں پر عمل کرنے کے لیے تیار ہوجاتے ہیں۔

د- عزم وتوکل:

آخری ارشاد جو اہلِ امر کی ہدایت کے لیے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے' اس کا مفاد یہ ہے کہ جب ضروری مشورت کے بعد ایک معاملہ طے ہوجائے تو پھر اس پر ذہن کو یکسو کرکے مضبوطی سے قائم ہوجانا چاہیے۔ ایک بڑی جماعت کے اہلِ امر کو روزمرہ کے مختلف پھیلے ہوئے امور و مسائل میں فیصلے ہوجانے کے بعد بھی اختلاف آراء کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور مسلسل نوبنو مشورے ان کے آگے رکھے جاتے ہیں ۔ لیکن اگر فیصل شدہ امور میں بار بار ادل بدل کی پالیسی اختیار کی جائے تو عملی سرگرمیوں کا ایک رخ پر کامیابی سے چلنا ممکن نہیں رہتا۔ بلکہ الٹا اہلِ امر کے دلوں میں تذبذب اور انتشار فکر کی خرابی ابھرتی ہے' جس سے جماعت کی مجموعی پالیسی میں بھی دوامی اضطراب پیدا ہوجاتا ہے۔ انہی وجوہ سے شارع نے یہ چاہا ہے کہ باقاعدہ ایک نتیجے پر پہنچ جانے

کے بعد مشورے دینے والے رفقا کو اس بات کی تربیت کی جائے کہ وہ فیصل شدہ امور کو قبول کرکے عملی ذمہ داریوں کو پورا کریں۔

تنظیمی امور

نظم امر و طاعت کے سلسلے میں کہنے کی باتیں اور بھی ہیں :

ا - ہدایات و سرکلرز کی شرعی حیثیت:

مختلف امارتوں اور تنظیمی دفتروں کی طرف سے جو سرکلر اور ہدایت نامے جاری ہوتے ہیں' ان کے بارے میں طاعت کی شرعی فرضیت کا احساس کچھ کمزور ہے۔ ان ہدایات اور گشتی مراسلوں کو غالبًا معمولی دفتری چیزیں سمجھا جاتا ہے' حالانکہ جماعت کے نظامِ امارت کے تحت کوئی بھی قیم یا سکرٹری جب بھی کوئی مراسلہ جاری کرتا ہے تو اس کی حیثیت عین اسی "امر بالمعروف" کی ہوتی ہے جس کے بارے میں "وَاَطِيْعُوا اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ" کو لازم ٹھہرایا گیا ہے۔ یہ مراسلے درحقیقت اس قابل ہوتے ہیں کہ ان کے ایک ایک لفظ پر پورا غور کیا جائے اور ان کی بروقت تعمیل کے لیے پوری پوری قوت صرف کی جائے ----- اسی جذبہ عبودیت کے ساتھ جس کے ساتھ تمام احکام شریعت کی تعمیل کی جاتی ہے۔

ب - پابندیٔ وقت:

اجتماعات میں حاضری کے لیے جو وقت مقرر کیا جاتا ہے' کسی ڈیوٹی پہ پہنچنے کے لیے جو موقع اور جو لمحہ طے کیا جاتا ہے' اور اسی طرح کسی اطلاع یا رپورٹ کے پہنچانے یا کسی امر کی تعمیل کے لیے جو صورت یا جو گھڑی متعین کی جاتی ہے' اس کی پابندی کرنے میں جس باقاعدگی کی ضرورت ہے وہ ابھی ہم میں پیدا نہیں ہوئی۔ اس بات پر فخر کرنا ایک فضول حرکت ہے کہ دوسری جماعتوں سے ہماری باقاعدگی کا جو کم سے کم معیار قائم ہونا چاہیے' وہ ہوسکا ہے یا نہیں ؟ ----- افسوس ہے کہ وہ ابھی نہیں ہوسکا' اور اس کے لیے خاص فکر کرنے کی ضرورت ہے۔ لوگ اب تک اس ذمہ داری کا پورا پورا احساس اپنے اندر پیدا نہیں کرسکے کہ ان میں سے ہر فرد کی حیثیت ایک چلتی کل کے پرزے کی سی ہے۔ وہ پرزہ اگر اپنا مقررہ فرض سرانجام دینے میں تاخیر کردیتا ہے' یا بے قاعدگی سے کام لیتا ہے' تو ساری کل اپنا وظیفہ بروقت پورا کرنے میں ناکام رہ جاتی ہے۔ اس کوتاہی کو ساتھ لے کر ہم کسی بڑی مہم میں کامیاب نہیں ہوسکتے۔ رفقا کو چاہیے کہ اپنے آپ کو

نظم جماعت کی کل کے پرزوں کی حیثیت سے باقاعدگی کے ساتھ کام کرنے کا فن سکھائیں۔

ج۔ احساسِ گناہ:

جیسا کہ اوپر کی بحثوں سے واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے' طاعت امر و طاعت نظم میں کوتاہی کرنا ایک معصیت ہے جس کے لیے اپنے آقا و مولا کے حضور میں جواب دہی کرنی ہوگی۔ لیکن محسوس یہی ہوتا ہے کہ اس طرح کی کوتاہیوں پر رفقا میں بندوں کی طرف سے باز پرس ہونے پر ایک حد تک ندامت تو ہوتی ہے' لیکن ان میں بالعموم وہ احساس گناہ رونما ہوتا جو ہونا چاہیے۔ طاعت امر اور طاعت نظم میں کوتاہی' جھوٹ بولنے' کسی کو گالی دینے' وعدہ خلافی کرنے' حق تلفی کرنے' خیانت کرنے' چوری کرنے' غیبت کرنے' جھوٹی شہادت دینے اور اسی طرح کے دوسرے بڑے بڑے جرائم سے کم درجے کی چیز نہیں ہے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ انفرادی اخلاق کے مذکورہ بالا تقاضوں سے اگر کبھی انحراف ہوجائے تو فوراً کھٹک ہونے لگتی ہے اور توبہ وانابت الی اللہ کا جذبہ ابھرتا ہے' لیکن جماعتی اخلاق کے تقاضوں کو پامال کرنے پر دلوں میں گنہ گار ہونے کا وہ احساس ندامت پوری طرح نہیں ابھرتا جو فوراً توبہ و استغفار اور تلافی مافات اور اصلاح طرز عمل کی شکل اختیار کرلے۔

جماعتی اخلاق کی قدر و قیمت انفرادی اخلاق سے بدرجہا بلند ہے' اور اسی وجہ سے جماعتی اخلاق میں کمزوری دکھانا زیادہ قسم کی معصیت ہے۔ رفقا کو اب اس حقیقت کا احساس کرنا چاہیے۔ ہم اگر فرائض مفوضہ کو انجام دینے میں' کسی کام کے لیے وقت نکالنے میں' کسی پروگرام میں اپنا حصہ ادا کرنے میں' کسی موقع متعین پر بروقت پہنچنے میں' یا دوسری طرف اہل امر کے حقوق ادا کرنے میں' ان کی خیرخواہی کے تقاضے پورے کرنے میں' صحیح اسلوب تنقید اختیار کرنے میں' مشورے اور معلومات بہم پہنچانے میں' راز داری کا حق ادا کرنے میں' یا طاعت امر سے عہدہ برآ ہونے میں کوئی کوتاہی دکھا جائیں تو ایسی ہر کوتاہی پر ایک شدید قسم کا جذبہ ندامت ہمارے اندر ابھرنا چاہیے ——— ایسا جذبہ ندامت جو توبہ استغفار پر مائل کرلے' جو عجز کی پیشانی حضور رب العالمین میں جھکانے پر آمادہ کرے' جو متعلقہ اہل امر یا رفقا سے معذرت طلبی پر اکسائے' جو تلافی مافات کے لیے زیادہ شدید سرگرمی کار پیدا کرے' اور جو انفاق کی اسپرٹ کو ابھارے۔

یہ بات اگر ہم میں پیدا نہ ہوگی تو اسلامی خطوط پر اپنے نظم جماعت کو نشوونما دینا ہمارے لیے کبھی ممکن نہ ہوگا؟

احساسِ ذمّہ داری

امر و طاعت کے مذکورہ بالا تقاضوں کو نہ محض اپیلیں پورا کرسکتی ہیں، نہ دستور و آئین کی دفعات، بلکہ صرف رفقائے جماعت کا احساس ذمہ داری ہی ان تقاضوں کی تکمیل کا ضامن ہوسکتا ہے اگر ہر رفیق اس معاہدے کو ذہن میں تازہ رکھے جو اس نے جماعت سے تعلق قائم کرتے ہوئے اپنے اللہ سے مومنین کو گواہ بنا کر استوار کیا ہے، تو اس کا یہ احساس ذمہ داری زندہ رہ سکتا ہے۔ اس احساس کا تقاضا یہ ہے کہ ہر رفیق یہ بات پیش نظر رکھے کہ جماعت اسلامی کا نظم اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے ایک امانت ہے، جس پر وہ اپنے دوسرے ساتھیوں کی طرح نگران اور پہرہ دار بنایا گیا ہے۔ یہ وہ قیمتی امانت ہے جسے وجود میں لانے کے لیے تاریخ کے ہزار ہا عوامل کام کرتے رہے ہیں، اور یہ وہ امانت ہے جس پر بہت سے دماغوں کی محنت، بہت سا روپیہ، بہت سی شب بیداریاں، بہت سی دوڑ دھوپ، بہت سی قربانیاں صرف کی جاچکی ہیں، اور جسے نشوونما دینے میں بہت سے بندگان خدا نے اپنا خون پسینہ ایک کیا ہے۔

اس نظم میں اگر کوئی قوت ضعف لانے کی کوشش کرے تو اس کی دست برد سے اس امانت کو بچانا ہر رفیق کا اولین فرض ہے۔ جو لوگ اس فرض میں کوتاہی کریں وہ اس پہرے دار کی طرح ہیں جو اپنی ذمہ داریوں کی انجام دہی میں خیانت سے کام لیتا ہے۔

پس رفقا کو ایک ایسی فضا بنا دینی چاہیے اور ایسی روایات قائم کرنے میں مسلسل مصروف رہنا چاہیے کہ جس میں نظم جماعت پر اثر انداز ہونے والا کوئی مفسدہ سر نہ اٹھا سکے۔ اور اگر کوئی نامطلوب چیز ابھرے تو وہ جہاں ابھرے وہیں اس کو خوش اسلوبی سے دبا دیا جائے۔ صرف یہی ایک صورت ہے جس کے ہوتے ہوئے اہل امر اور مامورین دونوں اپنی اپنی حدود میں کتاب و سنت کے مطالبات کے مطابق چل سکتے ہیں۔

باہمی تعلقات کی بنیادیں

امر و طاعت کا نظم، اسلام کے تقاضوں کے مطابق صرف ایسی جماعتی فضا میں چل سکتا ہے جس میں افراد کے باہمی تعلقات صحیح اخلاقی بنیادوں پر استوار ہوں۔ ان اخلاقی بنیادوں کو خدا اور رسولؐ نے ٹھیک ٹھیک متعین کردیا ہے۔ خصوصیت سے سورۂ حجرات میں وہ اہم اصول مختصراً یکجا بیان کردیئے گئے ہیں جو اسلامی سوسائٹی اور اسلامی جماعت کے ارکان کے پیش نظر رہنے چاہئیں۔ یہاں بالا جمال ان کا تذکرہ کیا جاتا ہے:

۱۔ مجلسی زندگی کو درست رکھنے کے لیے پہلا یہ حکم ہے:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَآءَکُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَیَّنُوْٓا اَنْ تُصِیْبُوْا قَوْمًۢا بِجَھَالَۃٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰی مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِیْنَ (الحجرات ۴۹ : ۶)

اے اہلِ ایمان! اگر کوئی فاسق تم تک کسی خبر کو لائے تو اس کے بارے میں (فیصلہ کرنے سے قبل) تحقیق کرلو' تاکہ تم کسی گروہ پر نادانی میں (مشتعل ہوکر) نہ ٹوٹ پڑو اور بعد میں اپنے کیے پر پچھتاؤ۔

کسی اہم قسم کی خبر' اطلاع یا بیان کے سننے پر فوراً اس کے حق ہونے کا فیصلہ کرلینا بسا اوقات غلط نتائج تک پہنچاتا ہے۔ اس قسم کی غلطی پر آخر کار پشیمانی ہوتی ہے۔ یہ ہدایت عام ہے' لیکن ایک اسلامی سوسائٹی میں رفقا کو باہم اس پر سختی سے کاربند ہونا چاہیے' اور ایک دوسرے کے متعلق فساق کی لائی ہوئی اطلاعات پر فوراً فیصلے نہیں کرلینے چاہئیں۔ جب شیاطین جن و انس کی تگ و دو عام ہو' اس وقت تو اس ہدایت سے ایک لمحہ کے لیے نگاہ کو ہٹنے نہ دینا ہی لغزشوں سے بچا سکے گا۔

(ب) اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ فَاَصْلِحُوْا بَیْنَ اَخَوَیْکُمْ (الحجرات ۴۹ : ۱۰)

اہلِ ایمان باہم ایک دوسرے کے لیے بھائی ہیں' پس اپنے بھائیوں کے درمیان مصالحت کراؤ۔

اس حکم کا منشا ظاہر ہے' ایک مسلم سوسائٹی کے ارکان میں اگر کبھی بہ تقاضائے بشریت رنجش' کدورت یا جھگڑا پیدا ہو تو دوسرے رفقا کا کام یہ نہیں کہ وہ فتنہ کی آگ کو ہوا دینے میں لگ جائیں' بلکہ ان کا کام یہ ہے کہ وہ بدگمانیوں کو دور کرنے' دلوں کو قریب کرنے' اشتعال کو رفع کرنے کی کوشش کریں' یہاں تک کہ اخوت کا وہ تعلق بحال ہوجائے' جس کے بغیر کسی اسلامی جماعت کا نظم مضبوط نہیں ہوسکتا۔

طرح طرح کے باہمی ہنگاموں میں جماعتِ اسلامی کو اس ہدایت کے مطابق اپنا مصالحانہ طرزِ عمل لے کے میدان میں آنا ہوگا۔ جب مختلف عناصر مسلم افراد اور مسلم برادریوں اور مسلم جماعتوں کو لڑانے کی کوشش کررہے ہوں تو اس وقت جماعت اسلامی یہ پارٹ ادا کرے کہ وہ پوری ملت کو مصالحت کا درس دے' عصبیتوں کی آگ کو ٹھنڈا کرے' اور "حبل اللہ" پر جمع ہونے اور ہر حال میں اسلامی اصولوں پر کاربند ہونے کی دعوت دے۔

(ج) یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا یَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓی اَنْ یَّکُوْنُوْا خَیْرًا مِّنْھُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰٓی اَنْ یَّکُنَّ خَیْرًا مِّنْھُنَّ ۚ وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَکُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا

بِالْاَلْقَابِ ؕ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِیْمَانِ ۚ وَمَنْ لَّمْ یَتُبْ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (الحجرات ۴۹: ۱۱)

اے اہل ایمان! تم میں سے کوئی گروہ دوسرے گروہ کا مذاق نہ اڑائے کیونکہ عین ممکن ہے کہ وہ ان کے مقابلے میں بہتر لوگ ہوں' اور نہ عورتیں عورتوں کا مذاق اڑائیں' کیونکہ عین ممکن ہے کہ وہ ان کے مقابلے میں بہتر خواتین ہوں۔ اور باہم ایک دوسرے کی عیب چینی نہ کرو' اور ایک دوسرے کے توہین آمیز نام نہ دھرو' ایمان لانے کے بعد گنہ گارانہ نام دھرنا بہت برا ہے۔ اور جو کوئی (ان حرکات سے) توبہ نہ کرے تو ایسے لوگ ظالم ہیں۔

اس ارشاد کے ذریعے باہم تمسخر کرنے' عیب چینی کرنے اور تذلیل آمیز نام دھرنے سے روکا گیا ہے' اور انتباہ کیا گیا ہے کہ جو لوگ ان عادتوں سے باز نہ آئیں ان کا مقام مومنین صالحین کی صف میں نہیں' ظالمین کی قطار میں ہے۔ یہ وہ چیزیں ہیں جو ایک سوسائٹی کے نظام کے لیے دیمک کا سا کام کرتی ہیں۔ ان چھوٹی چھوٹی زیادتیوں سے باہم دل پھٹ جاتے ہیں' جس جماعت میں طنز و تعریض' پھبتی اور' تمسخر' تذلیل و توہین وغیرہ مفاسد پھوٹ نکلتے ہیں وہ کبھی بھی وحدت و اخوت کے معیار پر قائم نہیں رہ سکتی۔ جماعت اسلامی کے ہر کارکن کو ان مفاسد سے پوری طرح پاک ہونے کی کوشش کرنی چاہیے۔

کسی بھی کشمکش میں آپ کو قدم قدم پر ان مفاسد کا سامنا کرنا پڑے گا' اور آپ کا جی چاہے گا کہ آپ بھی مزے لے لے کر دوسروں کا تمسخر اڑائیں' دوسروں کے عیب ڈھونڈ ڈھونڈ کر بیان کریں' ان کے نام دھریں' اور ان پر فقرے چست کریں' لیکن اگر مذکورہ بالا آیت نگاہوں کے سامنے رہے گی تو انشاء اللہ ظالمین کی صف میں جا کھڑے ہونے سے بچ سکیں گے۔

(د) یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِیْرًا مِّنَ الظَّنِّ ۫ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا یَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا ؕ اَیُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ یَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِیْهِ مَیْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِیْمٌ (الحجرات ۴۹: ۱۲)

اے لوگو' جو ایمان لائے ہو بہت گمان کرنے سے پرہیز کرو کہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں' اور تجسس نہ کرو' اور کسی کی غیرحاضری میں بدگوئی نہ کرو! کیا تم میں سے کوئی اسے پسند کرتا ہے کہ اپنے بھائی کے مردار گوشت کو کھائے (نہیں بلکہ) اس سے تم کو گھن آتی ہے۔ اور اللہ سے ڈرو یقیناً وہ (توبہ کرنے والوں کو) معاف کرنے والا' مہربان

ہے۔

اس آیت کا اولین تقاضا یہ ہے کہ باہم بدگمانیاں نہ کی جائیں، شکوک اور شبہات کی فصل دلوں میں نہ اگائی جائے، اور تہمتیں نہ تراشی جائیں اور نہ ادھر ادھر سے سن کر کسی تہمت کو بیان کیا جائے، کیونکہ ہر وہ شبہ یا تہمت جو درحقیقت بے بنیاد ہو، ایک معصیت ہے۔

دوسرا تقاضا یہ ہے کہ باہم تجسس نہ کیا جائے۔ تجسس کے معنی یہ ہیں کہ لوگ ایک دوسرے کے عیب ڈھونڈنے میں پڑے رہیں، یا ہر طرف رازدارانہ باتوں کو سونگھتے پھریں، یا مختلف مجالس کی سن گن رکھنے کے لیے سرگرم رہیں۔ یہ انتہائی معیوب اور نظم کے لیے تباہ کن حرکات ہیں۔

تیسرا تقاضا یہ ہے کہ ایک دوسرے کی غیرحاضری میں اس کی برائیاں بیان کرکے مزے نہ لیے جائیں، کیونکہ یہ فعل اتنا ہی گھناؤنا ہے جتنا یہ کہ آدمی جس کی غیبت کررہا ہو اس کی بوٹیاں نوچ نوچ کے کھائے۔ ان تقاضوں کو جتنا زیادہ پیش نظر رکھا جائے گا جماعت کی وحدت اور رفقا کی اخوت اتنی ہی مستحکم ہوگی، اور نظم امر و طاعت ٹھیک طرح اپنا کام کرتا رہے گا۔

اجتماعی ہنگاموں کے دوران میں اس آیت کے ہر مطالبے کو لوگ پامال کرتے نظر آئیں گے۔ اور نہ معلوم کن کن مسلمانوں کا گوشت بھرے جلسوں میں مزے لے لے کر کھایا جائے گا۔ لیکن جماعت اسلامی کے کارکنوں کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ اس کے تقاضوں کو ہر لحہ پیش نظر رکھیں اور اللہ سے ڈرتے ہوئے ان اخلاقی مکروہات سے اپنے آپ کو بھی بچائیں اور دوسروں کو بھی بچانے کی کوشش کریں۔

(معروف و منکر، ص ۱۳۰ تا ۱۳۳)

بڑے نصب العین کے بڑے تقاضے

بڑے بڑے اجتماعی نصب العین (خصوصاً اسلامی) لے کر چلنے والوں کی زندگیاں اور ان کا پیدا کردہ ذہنی یا سماجی ماحول دوسروں سے زیادہ روشن ہونے چاہئیں۔ عمومی فضا محبت و ایثار کی ہونی چاہیے۔ ہر کوئی دوسروں کی قدر کرنے والا اور ان کی ہر تکلیف کو محسوس کرنے والا ہو، اور وہ اہتمام کرے کہ اگر وہ کوئی خدمت نہ کر سکے گا تو کسی دوسرے کو کسی طرح کی اذیت بھی اپنی جانب سے نہ پہنچنے دے گا۔

پھر برادرانہ جذبے سے دل اتنے کھلے ہونے چاہئیں کہ اگر کسی شخص کے طرزِ عمل پر کوئی دوسرا اعتراض اٹھائے، یا کسی مجلس میں تنقید کرے، تو وہ دل میں انتقامی جذبے کی گرہ ڈال کر نہ

بیٹھ جائے کہ آئندہ جب کبھی موقع ملے گا، وہ بھی غصے کا جواب دہلے سے دے گا۔

اس سے بھی زیادہ ضروری یہ امر ہے کہ ہمارے کارکن جن میں بہت سے اچھی طرح ماہرِ تکلم نہیں ہوتے' زورِ استدلال سے کام نہیں لے سکتے' ان میں سے کئی دیہاتی ہوتے ہیں جو ضرورت سے کہیں زیادہ اپنے سے بڑوں کا احترام کرتے ہوئے ان کے سامنے کسی اختلافی نکتے پر زبان کھولنے کی جرات نہیں کرتے۔ ہمارا فرض ہے کہ ان سب کو گلے لگائیں اور ان کے غیر ادبی اور سادہ اور کھرے انداز بیاں پر انھیں ڈانٹنے کے بجائے ان کے نفس مدعا کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ ان سے خود سوال کر کے پوری بات معلوم کریں۔ وہ بے چارے تو اپنے اس درد کو بیان کرنے کے لیے الفاظ اور انداز نہیں پاتے جو اس کلنٹے کی وجہ سے ہے جو ان کے ضمیر میں خلش کر رہا ہے۔ آپ پہلے انھیں دردمند اور دکھی تو سمجھیے' پھر ان کی بات سمجھنا آسان ہو جائے گا۔

سوالات' اعتراضات اور تنقید چونکہ اسلامی نظام جماعت کی صحت مندی کا لازمہ ہیں' اس لیے ان کے راستے کھلے رہنے چاہئیں۔ جب کبھی ان راستوں کو بند کیا جائے گا یا ان کے دروازوں میں بھاری کواڑ لگا کر ان کو مقفل کر دیا جائے گا' تو نظم کی صحت برقرار نہ رہ سکے گی۔ سوالوں اور اعتراضات کا آرام سے جواب دیجیے۔ اچھے دلائل سے جواب دیجیے۔ جواب اطمینان دلانے والا ہو' اس کے اطمینان میں جو خلل آیا ہے' اسے دور کیجیے۔

قائدین اور کارکنوں میں مساوات

تحریکی شعور کی اس لحاظ سے بھی بار بار تجدید کرنی چاہیے کہ اسلامی تحریک کے اصولوں کا اطلاق بڑوں اور چھوٹوں پر یکساں ہونا چاہیے۔ اگر کوئی عام کارکن غلطی کرے یا رکن لغزش کھائے تو جس درجہ کی گرفت اس کے لیے ہے' اسی درجہ کی گرفت ویسی غلطی پر عہدہ داروں اور قائدین کی بھی ہونی چاہیے۔ چھوٹوں پر گرفت کرنا اور بڑوں سے چشم پوشی کرنا' ایسا خطرناک طریقہ ہے جس کے لیے رسولؐ اللہ نے سخت وعید سنائی ہے۔

مثلاً جماعت کے کسی معاملے میں مقررہ پالیسی کے ہوتے ہوئے اگر ایک معمولی رکن کو حق نہیں کہ اس سے انحراف کرے' یا مقررہ پالیسی میں سے ایک اور شاخ نکال لے' تو اس کے کسی عہدہ دار اور لیڈر کو بھی اس کا حق نہیں۔ جماعت کے کارفرما اداروں اور اشخاص نے کسی شخص یا گروہ کو اسلام' جمہوریت اور امن کا دشمن قرار دیا ہو' تو کسی چھوٹے یا بڑے کو یہ جرات نہیں کرنی چاہیے کہ وہ ایسے گروہ کو اسلام' جمہوریت کا خادم قرار دے۔ یہ ڈھیل اگر جماعت کے تمام

افراد کو دے دی جائے کہ وہ جو اختلافی راہیں چاہیں اختیار کریں' اور انہیں جس دائرے میں چاہیں بیان کریں' تو ہماری پالیسی مینار بابل کا تماشا پیش کرے گی۔ ایسی گنجائش رکھنے سے ایک اصولی و مسلکی جماعت کا تو پورا ڈھانچہ ٹوٹ جائے گا۔

اسی طرح ہماری محکم روایات کا معاملہ ہے' جو شروع سے قائم ہیں' اور جن کے بارے میں قرار دادیں اور فیصلے اور بیانات موجود ہیں۔ کن طریقوں کو اختیار کرنا ہے کن کو نہیں' کن عناصر سے اتحاد ہو سکتا ہے کن سے نہیں' کیا نعرے لگائے جاسکتے ہیں کیا نہیں' مظاہروں میں کیا حرکتیں کی جاسکتی ہیں اور کیا نہیں' روایات کا ایک معلوم و معروف خاکہ موجود ہے' جسے ہمارے مخالف بھی جانتے ہیں۔ اسے توڑیں تو ہمارے اصول ٹوٹ جاتے ہیں' یعنی یہ خاکہ اصولوں ہی کے عملی انطباق سے نمودار ہوا ہے' اور اسے بار بار توڑنا اور بدلنا ہمارے جماعتی و تحریکی تشخص کے لیے ضرر رساں ہے۔

فسادِ تضاد

دنیا کی سب سے بڑی بلا تضاد ہے۔ یہ فرد کے خیالات اور طرز عمل میں ہو' تعلیم میں ہو' نظام جسمانی میں ہو' ہر جگہ وہ باعث فساد ہے۔ خصوصاً تنظیمی ہیئتوں کے لیے تو وہ مہلک ہے۔ ہلکے ہلکے اور دھیمے دھیمے تضاد اس طرح عمل کرتے ہیں جیسے سلو پوائزن۔ اوّلاً" خرابیاں آہستہ آہستہ سطح سے نیچے ہی پھیلتی جاتی ہیں۔ پھر جب اپنے نتائج کے ساتھ ظاہر ہوتی ہیں تو ان پر قابو نہیں پایا جاسکتا۔ عقیدہ اور عمل میں' ' دعوت اور کردار میں' ذکر و عبادت اور سیاست و معیشت میں' جہاں بھی کہیں تضاد کا روگ ہوگا وہ اپنے کرشمے دکھائے گا۔ اور درحقیقت یہ تضادات ہی ہوتے ہیں کہ ماضی اور حال میں' اعلانات اور کارروائیوں میں' بڑوں اور چھوٹوں کے رویوں میں' ظاہر اور باطن میں 'جماعتی پالیسیوں کی تعبیرات میں' پہلے دھیمے دھیمے طریق سے کام کرتے ہیں اور پھر زور شور سے۔ اگر پہلے مرحلے میں ان کی روک تھام نہ ہو سکے تو پھر اس تباہ کن طوفان کو کنارے پر کھڑے ہو کر دیکھنے والے رنج و غم سے دیکھتے ہیں' مگر خون کے آنسوؤں سے بھی اس کو روک نہیں سکتے۔

میرے پیارے ساتھیو! عزیز بھائیو! محترم بزرگو! خدا کے لیے نگاہ رکھو کہ کسی پہلو سے تضادات نہ ابھرنے پائیں۔ تضادات کا شجرۃ الزقوم ایک دفعہ جڑ پکڑ گیا تو آپ کوئی کام نہ کر سکیں گے۔

لیپا پوتیاں علاج نہیں

اوپر جن باتوں کا ذکر ہوا ہے ان کے بارے میں یہ بھی جان لیجیے کہ خرابیوں کا حقیقی اور مؤثر حل لیپا پوتیوں سے نہیں ہوا کرتا۔ زخم کا یہ کوئی علاج نہیں ہے کہ آپ نے اس پر نہایت رنگین ریشمی پٹیاں لپیٹ دیں' اور بیان دے دیا کہ یہاں کوئی زخم نہیں۔ گندگی کا ازالہ یوں نہیں ہو سکتا کہ جہاں جہاں وہ سامنے آئے یا کوئی دوسرا متوجہ کرے' آپ وہاں وہاں اخبار کا کاغذ اس پر پھیلا کر کونوں پر پتھر رکھ دیں۔ معاملات کو ہمیشہ صاف طور سے لینا چاہیے۔ آپ کے اسلامی طریقے سے جب کوئی انحراف ہو تو صاف صاف کہیے کہ انحراف ہوا ہے' اور کوئی دوسرا توجہ دلائے تو اس کی بات کو مانیے کہ تم نے ٹھیک توجہ دلائی۔ جس کسی نے قدمِ انحراف اٹھایا ہو اسے بالمشافہ کہیے کہ صاحب! آپ نے یہ غلطی کی ہے' اور ایسی غلطی کی گنجائش ہمارے اصولوں اور روایات میں نہیں ہے۔ پھر ان صاحب کے تعاون سے کسی قطعی اور حتمی فیصلے تک پہنچیے' اور اس کو ڈیکلیئر کیجیے۔ بے شمار ایسے اختلافی یا نزاعی معاملات پیدا ہو کر پھیلتے رہیں گے' اگر ہم نے ایمانی و اخلاقی جرأت کے ساتھ روک تھام نہ کی۔

ہم دینِ حق کے علمبردار اور شہادتِ حق کے ذمہ دار ہیں۔ ہمیں حق کہنا چاہیے دوسروں کے متعلق بھی' اپنے متعلق بھی۔ کبھی آدھا حق کہہ کر' دوسرا آدھا حق چھپا نہ دینا چاہیے' اور واقعہ کے کسی حصے کو لپیٹنا نہیں چاہیے' بلکہ جرأت سے پورا حق کہنا چاہیے' خواہ اس کی زد ہم پر پڑتی ہو۔

(تحریکی شعور' ۱۹۸۹ء' ص ۹۳ تا ۹۷)

ب ۔ اختلاف اور اس کے آداب و حدود

بقول ذوق اختلاف ہی سے ساری رونق قائم ہے' ذوقِ اختلاف کی گندھاوٹ عین انسانی فطرت میں ہے۔ لیکن اختلاف کی کچھ حدیں ہیں جن تک وہ محدود رہیں تو اختلافات سے خیروخوبی پیدا ہوتی ہے' مگر حدود مناسب سے جب اختلاف آگے بڑھتا ہے تو خرابی و فساد کا باعث بنتا ہے۔

اصولی طور پر اس کی آخری حد وحی سے متعین ہوتی ہے' جیسے کہ مختلف مقامات پر مصحفِ پاک میں یہ مدعا بار بار بیان ہوا:

فَمَا اخْتَلَفُوْٓا اِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًاۢ بَيْنَهُمْ (الجاثیہ ۴۵ : ۱۷)

"انہوں نے العلم کے آجانے کے بعد ہی اختلاف کیا ہے' باہمی کشمکش کی بنا پر۔"

یعنی اہل ایمان کے ہر اختلاف و کش مکش کو العلم کے سامنے آنے پر ختم ہوجانا چاہیے۔ العلم سے مراد حکم خدا و رسولؐ یا نص ہے۔ اسی بات کو قرآن کریم نے یوں بھی واضح کیا ہے:

وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيْهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ (الشوریٰ ۴۲ : ۱۰)

"پھر جس معاملے میں بھی تم اختلاف کرو' تو اس کا فیصلہ کرنے والا اللہ ہے۔"

یہ تو سب سے بڑی اصولی بات ہے' لیکن تفصیلات بہت سی ہیں۔

یقیناً بعض جزئی اختلافات نیک نیتی سے بھی ہوسکتے ہیں' مگر ایسے اختلافات اگر غل و غش سے پاک ہوں تو ان کا حل خدا اور رسولؐ کے فرمودات کی روشنی میں فریقین خوش خلقی اور خوش بیانی سے خود ہی کرلیتے ہیں' لیکن بیشتر صورتوں میں اختلافی رجحانات و جذبات میں شیطان نفسانیت کی ملونی ڈال دیتا ہے۔

بنیادی اصول

اختلاف کا معاملہ ایسا ہے کہ قرآن و حدیث میں بڑے جامع انداز سے اسلامی حکمتِ اختلاف کو بیان کردیا گیا ہے اور ہر نکتہ کے ساتھ واقعاتی نظائر موجود ہیں۔ ان ساری تفصیلی ہدایات کو جمع کرنا ممکن نہیں' کوشش یہ ہے کہ ان کا ماحصل سامنے لایا جائے۔

اسلامی حکمتِ اختلاف سے استفادہ کرنے سے پہلے یہ بات ذہن نشین کرنی چاہیے کہ دینِ برحق جن مقاصد کے لیے آیا ہے' ان کا حصول اس کے بغیر ممکن نہیں کہ توحید کی بنیاد پر مسلمانوں کی مضبوط وحدت (بنیان مرصوص) استوار ہو۔ یہی اشارہ ہے فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا "پھر تم خدا کی مہربانی سے بھائی بھائی بن گئے۔" (آل عمران ۳ : ۱۰۳) کا۔ توحید جتنی صحیح طور پر دلوں میں راسخ ہوگی' اہل توحید کا اتحاد بھی اتنا ہی مضبوط ہوگا۔

پھر حقیقت کا ایک پہلو یہ سامنے رکھنا چاہیے کہ جس شخص کی نگاہ آخرت پر زیادہ مرتکز ہوگی' یا جو کوئی اپنے نصب العین کے عشق میں سرشار ہوگا' اسے چھوٹے قضیوں اور جھمیلوں سے دلچسپی نہ رہے گی اور وہ وقت اور قوتوں کا ضیاع پسند نہ کرے گا۔

تیسری ضروری بات یہ ہے کہ اصل اختلاف ایمانیات یا زندگی کے بنیادی تصورات کا اختلاف ہوتا ہے' بعد ازاں اصول و احکام کی تعبیرات کے اختلافات سامنے آتے ہیں' پھر تدابیر' مصالح اور انتظامی امور کے اختلافات' اور آخری درجے پر ذاتی مغلو کے اختلافات۔

پہلی قسم کے اختلافات تو اسلام پر ایمان لاتے ہی اہل ایمان کے درمیان ختم ہوجاتے ہیں۔ دوسری قسم کے اختلافات علمی، تحقیقی اور استدلالی ہوتے ہیں۔ جن کا فیصلہ استدلالی طریقوں سے ہونا چاہیے، اور جن کو اگر فریقین خود حل نہ کرسکیں تو کوئی ایسا شخص یا ادارہ ڈھونڈا جاتا ہے جو "فوق کل ذی علم علیم" کے مطابق علمی لحاظ سے فائق اور بلند تر اور معتمد علیہ ہو۔ تدابیر و مصالح کے اختلافات میں سے بعض بہت زیادہ اہمیت والے ہوتے ہیں اور بعض کم اہمیت والے۔ ان کو حل کرنے میں استدلالی طریق کے علاوہ شورائیت کے اس اصول کو بھی برتا جاسکتا ہے کہ چند افراد خود یا زیادہ وسیع حلقے کے اجماع تام یا اجماع ناقص کے سامنے سر تسلیم خم کردیں۔ نہ کریں تو پھر کوئی حل نہیں۔ آگے افتراق ہی افتراق اور فساد ہی فساد ہے۔

سب سے آخری درجہ انفرادی یا گروہی مفاد کی کشمکش سے پیدا ہونے والے اختلافات کا ہے۔ ان کا حل گفتگو اور دلائل سے نہ ہوسکے تو پھر ثالثی یا تحکیم یا عدالتی انداز سے ہوجانا چاہیے، اور فریقین جس طریقے کو بھی مانیں، اس کے تحت ہونے والے فیصلے کا دونوں کو پابند ہونا چاہیے --- خواہ نفع ہو یا نقصان! اور کسی صورت میں بھی کسی فریق کو بدگمانی نہیں کرنی چاہیے۔

یہ راستے خود شریعت ہی نے ہمیں بتائے ہیں۔ ان کو نہ مانا جائے تو پھر نزاعات کا کوئی حل نہیں ہے، اور دل و دماغ میں زہریلے آبلے پڑ جائیں گے اور زندگی آگ کے شعلوں سے بھر جائے گی۔ وہ چہرے جن پر مسکراہٹوں کے پھول کھلنے چاہئیں، ان پر نفرت کے تارکول کا غبار چپک جائے گا۔ اس غبار کو اگر دنیا میں نہ صاف کیا جاسکے تو خدانخواستہ آخرت تک بھی ساتھ جاسکتا ہے۔

آداب و حدود

اوپر درج شدہ آیت میں لفظ "بغی" کا استعمال ہوا، جس کے معانی میں زیادتی، ظلم اور بے جا حصول مفاد وغیرہ شامل ہیں۔ یہ بیماری مال یا مادی مفاد ہی تک محدود نہیں رہتی بلکہ انانیت، تکاثر و تفاخر، رشک و حسد، شہرت حاصل کرنا، اپنی عزت و ناموری کو بڑھانا اور دوسرے کا درجہ گھٹانا، قوت و اثر میں کسی دوسرے سے بڑھ جانے کے لیے غلط سلط طریقے اختیار کرنا، ان سب مظاہر کے پیچھے وہی بیماری دل کام کرتی ہے۔ اس طرح کے محرکات و عوامل کا مخفی زہر فکری یا تدبیری اختلافات میں آملتا ہے۔ کبھی کبھی کسی کے متعلق کوئی ایسی وجہ ناپسندیدگی پیدا ہوجاتی ہے یا

کبھی ایسی بدگمانیاں جمع ہو جاتی ہیں کہ ان کی وجہ سے کسی فرد یا گروہ کے لیے نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور پھر اس نفرت کا تلخ و گرم لاوا ہر قسم کے اختلافات کی بحثوں میں شامل ہو جاتا ہے۔ قرآنی تعلیمات کی رو سے کچھ چیزوں سے اپنی حفاظت کرنی چاہیے۔ مثلاً:

۱۔ کبر و تحقیر

اپنے آپ کو مقامِ کبر (جس کی بنیادیں مادی فوقیتوں، علمی بالا تری، زہد و تقویٰ میں پیش روی، لسانی و قلمی مہارت یا عہدہ و منصب جیسی چیزوں پر استوار ہوتی ہیں) پر رکھ کر دوسروں کی تحقیر و تضحیک نہ کی جائے۔

۲۔ بلا تحقیق قبول و نقل

کسی بھی قسم کی سرسری افواہوں پر جو کسی دوسرے شخص کے، (خصوصاً جس کے متعلق پہلے سے کوئی پھانس موجود ہو) بارے میں موصول ہوں، اچھی طرح تحقیق کیے بغیر کوئی رائے قائم نہ کی جائے۔

۳۔ غیبت اور براہِ راست بات چیت

غیبت کا راستہ ہرگز اختیار نہ کیا جائے بلکہ شخص متعلق سے کوئی شکایت یا اس کے بارے میں کوئی اشتباہ ہو تو اخلاقی جرات سے کام لے کر براہ راست بات چیت کرلینی چاہیے۔ اپنی غلطی سامنے آ جائے تو معافی طلب کرلینی چاہیے اور دوسرے کو غلطی کا احساس ہو جائے تو بلا تامل معاف کر دینا چاہیے۔

اس الجھن کا کوئی حل میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اگر متعلقہ لوگ شکایت و شبہات سننے پر تیار ہی نہ ہوں، اور سنیں تو خوشگواری کے انداز کو برقرار نہ رکھ سکیں، نیز سن لینے کے بعد متکبرانہ انداز میں شکایت کرنے والے کو بلیک لسٹ کر کے پھر اس سے انتقام لینے کی چالیں چلنے لگیں، تو کیا ہو؟ میری رائے میں یہ حالت کسی اوسط درجہ کے اسلامی معاشرے خصوصاً اس کے تعلیم و تربیت پائے ہوئے افراد کی کسی تنظیم میں قابل تصور نہیں ہے۔ یہ حالت اگر عملاً پیدا ہو جائے تو پھر اسلامی کردار کی نشوونما کی امیدوں سے ہاتھ دھو لینا چاہیے۔

۴۔ زیرِ سطح منافرت انگیزی

چند افراد کے سلسلہ غیبت و نجویٰ سے بڑھ کر زیرِ سطح طوفان منافرت انگیزی زیادہ خطرناک ہے، جو دوب گھاس میں پھیلنے والے پانی کی طرح غیر محسوس طور پر دور دور تک کے رقبوں کو اپنی

لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ انتہائی بد نصیبی ہو گی کسی بھی دینی مقصد کے لیے جمع ہونے والے گروہ کی' جس میں شخصیتوں کی حمایت و مخالفت میں غیبت خانے کھل جائیں' اور پروپیگنڈہ سنٹر قائم ہو جائیں' نیز نشرو اشاعت کی مہارتیں کام کرنے لگیں۔ میں نے بعض اوقات ماہرین فن نمیمہ (چغل خوری) کو بے دغدغہ ذہن و زبان کا نہایت افسوس ناک استعمال کرتے پایا ہے۔ میں جب عالم تصور میں یہ نقشہ دیکھتا ہوں کہ کچھ لوگ آیتیں اور حدیثیں پڑھ پڑھ کر اختلافات و نزاعات کی آگ کو' مقدس دامنوں سے ہوا دے رہے ہیں تو غلبہ الحاد و ظلم کے اس دور کی تباہ کاریوں کا اندازہ کر کے میرے دماغ کا ذرہ ذرہ لرز جاتا ہے۔

۵۔ اصلاح بین الناس

دین کے سرچشمہ ہدایت میں مسلمانوں کے لیے بہترین اور صحیح رویہ "اصلاح بین الناس" کا ہے۔ جہاں کوئی اختلاف و نزاع موجود ہو' وہاں بجائے اس کے کہ کچھ افراد ایک جھنڈے کے پیچھے جمع ہو جائیں اور کچھ دوسرے کیمپ میں . . . اور پھر ایک طرف کی قوت اور دوسری طرف کی قوت رسہ کشی کرنے لگے تو جیت خواہ "ا" کی ہو' خواہ "ب" کی —— خدا و رسولؐ کے دین کے لیے جو مہم چل رہی ہے اسے ضرور نقصان پہنچے گا۔ آس پاس کے لوگوں کو چاہیے کہ وہ ایک طرف والوں کو بھی غلطیوں کا احساس دلائیں اور مخالفت کے لیے تلخی کو کم کرائیں اور دوسری طرف جا کر بھی اصلاح و درستی کا سبق دیں۔ یہ کوئی طریقہ نہیں کہ کوئی سی مسلمان جماعت ایک طرف کا جھنڈا اٹھا کر دوسری جانب کے لیے صرف کردار کشی کی مہم چلانے میں لگ جائے۔

ضمناً یہ بھی مجھے عرض کرنا ہے کہ جتھوں کی جب کبھی بھی کوئی کشمکش ہوتی ہے تو اسے حمایت صداقت کے نام پر اصولی رنگ ضرور دیا جاتا ہے۔ حالانکہ بیشتر نزاعات میں حقیقت و صداقت کے کچھ اجزا ایک طرف ہوتے ہیں' اور کچھ دوسری طرف۔ ایک طرف والے دوسری جانب کی صداقتوں کو زیر غور نہیں لاتے' اور دوسری جانب والے پہلے فریق کی صداقتوں کو تسلیم نہیں کرتے۔ صداقتوں کے اس طرح تقسیم ہو جانے کی صورت میں کسی طرف کے لیے صد فیصد حمایت یا مخالفت مغالطوں پر مبنی ہوتی ہے' اور دوسروں کے لیے مغالطہ انگیز نزاعات کی فضا میں مہم صرف صلح و سازگاری کے لیے چلانی چاہیے۔

لیکن اگر ہم میں سے کچھ لوگ ایک طرف اور کچھ دوسری طرف مل کر اور گفتگو کر کے ایک خصوصی نہج سے "کیس" مرتب کر لیں' اور اسے دوسرے فریق کے خلاف لے آئیں' تو ان کی

طرف سے تو پہلا قدم ہی نا انصافی کا اٹھ گیا' اب وہ آگے کیا انصاف کریں گے۔ جسے کسی معاملے میں مصالحت پسندی یا منصفی کے جذبے سے دلچسپی لینی ہو وہ ایک طرف ملاقاتیں کرے تو پھر دوسری طرف بھی کرے' ایک طرف سے "کیس" معلوم کرے تو دوسرے سے بھی جا کر دریافت کرے۔ اتنی فرصت نہ ہو' یا ذہن میں پہلے سے ذاتی قرب و بعد کا کوئی اثر موجود ہو تو ایسے جھگڑوں کے میدان میں اترنا ہر شخص پر فرض عین نہیں ہے۔ کئی اور نیک کام کرنے کے لیے موجود ہیں۔

مجھے بعض ناخوشگوار احوال پیش آنے پر یہ تکلیف دہ تجربہ ہوا کہ قرآن و سنت کے منشا کے مطابق غیر جانب دارانہ ذہن کے ساتھ مصالحت پسندی یا منصفی کے جذبے سے کم ہی کوئی شخصیت آگے بڑھتی ہے۔ زیادہ تعداد ایسی نکلتی ہے جس کا سلوگن زبان عمل سے یہ ہوتا کہ "اِدھر تم' اُدھر ہم"۔ اس "اِدھر اور اُدھر" سے جو تباہی قومی زندگی میں مچتی ہے اس سے اندازہ کر لیجیے کہ کسی جماعت یا کاروباری یا خاندانی دائرے میں یہی ذہنیت اگر داخل ہو جائے تو نتائج کیا ہوں گے۔ یہ راستہ افتراق اور گروہ بندی کا راستہ ہے' سوچ سمجھ کر چلیے اور سنبھل کر چلیے۔

اس میدان میں محض جانبدارانہ جذبات کے ساتھ آنکھیں بند کر کے غلط طور پر زور زباں یا زور قلم یا زور گفتار کا استعمال نہ دنیا میں مفید ہے' نہ آخرت میں باعث خیر۔

۶۔ مجالس سے باہر اظہار:

"المجالس بالامانۃ" کا اصول توڑنے سے بھی بہت سی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں' اور معاملات سلجھنے کے بجائے الجھتے ہیں۔ کوئی بات جس دائرے کے اندر کی تھی اس سے اٹھا کر باہر لے جانے کا قصور فریق "ا" سے جتنا سرزد ہو اس کا وہ ذمہ دار ہے' فریق "ب" سے جس حد تک صادر ہو اس کا وہ جوابدہ۔

۷۔ اظہارِ اختلاف

جن اختلافات کے بیان کرنے کا ایک دائرہ شریعت کی روشنی میں دستور اور روایات کے ذریعے خود ہم نے اپنے لیے مقرر کیا ہے' اس دائرے سے اختلاف کو باہر لے جانا ایک سنگین لغزش ہے۔ ایسی لغزش جس سے بھی سرزد ہو اور جو بھی ایسی غلطی کے کسی ذمہ دار کی حمایت کا علم اٹھائے وہ اپنے کردار کے مطابق آخرت میں تو جواب دہ ہے ہی' اس دنیا میں بھی متعلقہ لوگوں کے سامنے اس کے لیے وضاحت کرنا لازم ہے' اور خود لوگوں کو بھی وضاحت طلب کرنی چاہیے۔

اور اگر کسی کی غلطی واضح یا ثابت ہو تو اس پر انسانوں سے معذرت اور اللہ سے توبہ واستغفار ضروری ہے۔

۸ - قولِ سدید

فریقینِ اختلاف اور ان کے حما-تیوں کو اپنی کسی نزاع کے سلسلے میں جو بات بھی کہنی ہو' اسے صاف نیت اور اخلاقی جرات کے ساتھ قولِ سدید بنا کر پیش کرنا چاہیے۔ تشبیب و گریز اور لف و نشر اور کہ مکرنیوں کے اسالیب اختیار کر کے ایسی پر تضاد' الجھی ہوئی' طنزیہ اور چیستانی باتیں نہیں کرنی چاہئیں کہ باہم دگر مغالطوں اور تندی جذبات میں مزید اضافہ ہو۔ جو بھی دعویٰ یا شکایت یا اعتراض یا سوال برائے وضاحت طلبی ہو' اسے رشتہ منطق کو بل دیے بغیر سنجیدہ انداز میں بیان کرنا چاہیے۔ آدمی اگر کسی شخص کو برا سمجھتا ہے اور اسے برا کہنا چاہتا ہے تو بہت "اگر مگر" کے چکر میں پڑے بغیر قلب و ضمیر کی بات کہہ دینی چاہیے' بشرطیکہ اس سے مطلوب کی بہتری' الجھنوں کا حل' اللہ کی رضا اور روح کی تسکین ہو۔ اسی طرح جس کے خلاف آپ کیس پیش کریں' اس میں اگر کوئی خوبی ہو تو اسے کھلے دل سے ایسے انداز میں تسلیم کریں کہ آگے پیچھے کے جملوں سے یہ تاثر نہ ہو کہ آپ نے چاروناچار ایک بات تو کہی مگر اسے ملیا میٹ کرنے کا سامان بھی کر دیا۔

۹ - اتہام و تحقیق

عام حالات میں بھی' اور نزاعی ماحول میں خصوصاً' جب کبھی کوئی شخص دوسرے کے متعلق کوئی واضح الزام یا اتہام لے کر آئے تو جس کے سامنے بھی بات ہو اس کا اگر خدا پر ایمان اور تحریک سے لگاؤ ہو تو اس کی اولاً شرعی و اخلاقی' اور ثانیاً تنظیمی' ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اس پر دستاویزی یا شخصی شہادت طلب کرے۔ اس کے راوی اول یا ماخذ کا سراغ لگائے' اور جرح و تنقید کر کے بات کو منقح کر دے۔ یہ تعمیل ہو گی قرآنی حکم فَتَبَيَّنُوْا "جان پہچان کر لیا کرو" (النساء ۴: ۹۴)۔

جہاں ایک مرتبہ ایسا جماعتی یا سماجی ماحول بن جائے وہاں غلط بیانی' یا غیبت' یا تجوئی کرنے والے' چغلی کھانے والے' یا دوسروں پر تہمت لگانے والے کسی شخص کے لیے سخت مزاحمت پیدا ہو جاتی ہے' اور کوئی بھی شخص یادہ گوئی کی جرات نہیں کر سکتا۔ غیبت ہو یا الزام تراشی' ان خار دار جھاڑیوں کے اگنے کے لیے ایک خاص طرح کی زمین اور آب و ہوا درکار ہوتی ہے۔ ایسی

زمین اور ایسی آب و ہوا اپنے ہاں نہیں ہونی چاہیے۔

یہ بات بد ترین گالی سے بڑھ کر ہے کہ کسی شخص کے متعلق یہ کہا جائے کہ وہ کسی کے ہاتھ بک گیا ہے' یا فلاں کا آلہ کار ہے' یا اسے جماعت کے حلقے میں کار خاص کے لیے داخل کیا گیا ہے' جماعت اسلامی کا کوئی آدمی سنجیدگی سے یا طنزاً یا محض اذیت رسانی کے لیے اس طرح کی بھاری اور تلخ بات زبان یا قلم سے ادا نہیں کر سکتا--- تاوقتیکہ وہ حتمی ثبوت فراہم نہ کر سکے۔ دلائل اور موقف کی کمزوری آدمی کو بعض اوقات مجبور کرتی ہے کہ وہ اپنے دعوے کے وزن کی کمی الزامات کے ذریعے پوری کرے۔

اسلام میں اختلافات کا راستہ بہتانوں اور تہمتوں کا راستہ نہیں ہے۔ حد یہ کہ تہمتیں اخباروں میں چھپیں' ان کا چرچا ہو' وہ قریب اور دور کے ہزار ہا افراد تک پہنچیں۔ ایسی زیادتی جس سے بھی سرزد ہو اسے شرمسار ہونا چاہیے اور فریق متعلق سے معافی مانگنے کے ساتھ ساتھ استغفار کرنا چاہیے۔ کسی شخص کو بدنیت اور بے ضمیر قرار دینے کے بعد پھر بحث کاہے کی۔

یہ تو ایک عجیب منطق ہوئی کہ جب تک کسی ایک نکتے کا اختلاف واقع نہ ہوا ہو تو دونوں فریق ایک دوسرے کو اچھا سمجھتے ہوں اور تعریف کرتے ہوں۔ "ا" موقر و معظم اور "ب" بھی شستہ و شائستہ' اور دونوں اسلامی ذہن و کردار کے دانشور اور قائد مگر اختلاف ہونے کے بعد عزتوں اور شرافتوں اور قابلیتوں کا ایک دوسرے کی نگاہ میں خاتمہ ہو جائے۔

۱۰- احترامِ اختلاف

اختلاف کرنے والے کو مجرم بنا کر اس کے خلاف انتقام کا رویہ اختیار نہیں کرنا چاہیے۔ پہلی کوشش رفع اختلاف کی ہو یا کم سے کم کسی اختلاف کے ہوتے ہوئے مل کر چلنے کی راہ نکالی جائے۔ یہ معرکہ سر کرنے میں اگر دونوں طرف کی دماغی صلاحیتیں اور اخلاقی احساسات کامیاب نہ ہوں تو پھر ثالثی کے بعد ایک طرح کی عدالتی تحقیق کے ذریعے معاملے کو فیصل کرا کے دونوں فریقوں کو سر تسلیم خم کر دینا چاہیے۔ یہ ممکن نہ ہو تو پھر ہنستے مسکراتے جدا ہونے کے بعد سارا قصہ بھول بھلا دینا چاہیے۔ اسے پلے باندھ کر رکھنا اور پچھلی باتیں یاد کر کے اور نئے نئے نکتے ایجاد کر کے اور "جرمِ اختلاف" کی سزا دینے کی تدبیریں اختیار کر کے اپنے اور حریف کے اعصاب کی پسائی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ساری کارروائی ایک منفی کارروائی ہے۔ خدا خوفی سے آزاد آدمی یہ سوچتا ہے کہ جس نے اختلاف کی جسارت کی ہے اور گردن نہیں جھکائی ہے' اس

کے لیے جینا دو بھر کر دیا جائے' اس کے سلسلہ روزگار کو درہم برہم کر دیا جائے اور اس کی شخصیت پر الزامات و اتہامات کا شنوں ملبہ گرا دیا جائے۔

اگر نزع کے دو فریقوں میں سے کوئی ایک بھی اس منفی راستے پر قدم رکھنے سے انکار کر دے تو وہ اکیلے ہاتھ سے تالی نہیں بجا سکے گا۔ آخر پہلے بھی تو مولانا مودودیؒ نے مثال قائم کی اور جماعت کے لوگ اب بھی اس کے زیر اثر کئی حملہ آوروں کے حملہ ہائے پے در پے کے باوجود ان کا کبھی ذکر نہیں کرتے۔ کیا کسی کے لیے اس میں کوئی سبق نہیں ؟

یہاں تک بھی ایک بات ہے کہ آپ ایک بار دل کا سارا لاوا اگل لیں' اس پر بس نہیں تو دو بار سہی' مگر کسی "امرفی سبیل اللہ" کے لیے اول درجے کے دماغوں کا میدان میں آ جانا' کچھ کا اگلے مورچوں سے فائر کرنا اور کچھ کا دور پیچھے گائیڈنگ کیمپ کے تہہ خانوں میں بیٹھ کر حکم جاری کرنا' اخبارات و رسائل میں مضامین کی اشاعت' پمفلٹوں کی مہم' پھر ریشمی رومال تحریک کی طرح مکاتیب کی مہم' مراسلوں کا اجراء' ملک کے اندر ہی نہیں بین الاقوامی دائرے میں بھی' پھر کسی کی حمایت سے بعض افراد کو روکنے کے لیے ان پر وفود کے ذریعے سماجی دباؤ --- آخر یہ کوئی اسلامی یا شریفانہ اختلاف کے طریقے ہیں ؟ پھر اپنی اپنی صفیں الگ کرنے کی کوششیں ایسی ہیں جیسے کوئی انتخابی معرکہ یا ریفرنڈم در پیش ہے کہ ایک فریق زیادہ سے زیادہ ووٹ اپنی طرف جمع کر رہا ہے' دوسرا اپنی طرف۔

کیا رسہ کشی کے اکھاڑے کی ایسی داستانیں جماعتِ اسلامی کی روئیدادوں یا تاریخ کا جزو بننے کے قابل ہیں ؟

(تحریکی شعور' ۱۹۸۹' ص ۲۸۸ تا ۲۹۹)

ج۔ رفعِ اختلافات کا دینی طریقہ

کوئی بھی اجتماعیت اس حقیقت کو نظر انداز کر کے قائم نہیں کی جا سکتی' چاہے وہ مسجد کی کمیٹی ہو یا پارلیمنٹ' یا ریاست کہ افراد انسانی میں مختلف مسائل' معاملات' تدابیر و اقدامات کے بارے میں اختلافات ضرور ہوتے ہیں۔ اسی لیے ہر معقول اجتماعیت وہ طریقہ بھی ضرور متعین کرتی ہے جس کے تحت تمام اختلافات کسی ایک خط پر آ کر ختم ہو جاتے ہیں' یا اگر عقلی حد تک رہیں بھی تو وہ عملی کام میں حائل نہیں ہوتے۔

اسلامی اجتماعیت نے اختلافات کے بارے میں یہ طریقہ وضع کیا ہے :

اولین معیار فیصلہ چونکہ یہاں الکتاب اور الرسول ہے' اسی وجہ سے جو امور صراحۃ "کتاب و سنت کے نصوص سے ثابت ہوں' ان میں کسی کو اختلاف کرنے کا حق نہیں۔ ایسے معاملات میں صرف آمنا وصدقنا کا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔ منصوص معاملات میں اگر راہیں الگ الگ ہو جائیں اور ہر شخص کی تقسیم حلال و حرام اور تمیز جائز و ناجائز جدا جدا ہو تو کسی اجتماعیت کے قائم رہنے یا چلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ہاں' نصوص کی تعبیرات اور ان کے انطباقات میں نقطہ ہائے نظر کا فرق ہو سکتا ہے۔ یہ فرق اہل علم' سلف کے قابل اعتماد مفسرین و محدثین اور فقہاء کی تحقیقاتوں کی مدد سے بہ دلائل واضح کر کے نقطہ اتفاق پیدا کر سکتے ہیں۔ بیشتر معاملات میں اجماع اور قرون اولیٰ سے اب تک کا یکساں تعامل امت فیصلہ کن ہوتا ہے۔ پھر بھی اگر تعبیر و تاویل کے جزئی اختلافات رہیں تو وہ اگلی قسم کے مسائل کے ساتھ شامل ہو جاتے ہیں۔

اسلامی اجتماعیت کا اصل دائرہ اختلاف "تدابیر و مصالح سے تعلق رکھتا ہے۔ کب کیا بات کہی جائے ؟ کیا اقدام مناسب ہو گا ؟ کس رویے میں دین کی خیر خواہی اور ملت کی بہبود یا انسانیت کی فلاح ہے ؟ کس صورت میں تحریک اسلامی کا چہرہ زیادہ روشن ہو سکتا ہے ؟ کس رخ پر چلنے سے دعوت حق کی راہیں کھلتی اور آسان ہوتی ہیں ؟ کس چیلنج کا کیا جواب دینا مناسب ہو گا ؟ کس شخص یا گروہ کے بارے میں کیا رائے رکھی اور بیان کی جائے ؟ الجھنوں کے جنگل میں کیسے راستہ پیدا کرنا ہو گا ؟ کس شکل میں اجتماعیت کی زیادہ قوت مجتمع ہو سکتی ہے اور وحدت کی صف مضبوط ہو سکتی ہے ؟ وغیرہ وغیرہ۔

اختلافی امور کی اسی دوسری صنف میں تعبیر نصوص یا انطباقات احکام کا ہر وہ معاملہ بھی داخل ہو جائے گا جس کا حل اجماع یا تعامل امت یا علمائے سلف کی کاوشوں سے نہ ہو سکے۔

اس ذیل کے اختلافی امور کے لیے اصول مشاورت مقرر کیا گیا ہے' جس کے بعد اور کوئی طریقہ حل اختلافات موجود نہیں ہے۔ یہاں آ کر تمام بحثوں کو ختم ہو جانا چاہیے۔

مشاورت کے اساسی ضوابط

اسلامی مشاورت کے اساسی ضوابط حسب ذیل ہیں :

۱۔ نجویٰ اور جتھہ بندی سے اجتناب

اہم مسائل و معاملات کو اولی الامر (اربابِ مشاورت اور صاحبِ امر) کے حوالے کرنا چاہیے۔ یعنی پہلے سے نہ اس پر ایسی کھلی بحثیں ہونی چاہئیں کہ مختلف افراد اور گروہوں کے اندر حتمی آراء تشکیل پا جائیں، نہ کسی ایک دوسرے نقطہ نظر پر گروپ یا جتھے بن جانے چاہئیں، بلکہ گفتگوئیں محض مسئلے کو سمجھنے کے لیے ہوں اور کوئی آدمی کسی خاص رائے کو نہ تو حتمی فیصلے کے طور پر پیش کرے، نہ ایسے فیصلے کے حق میں نجویٰ convassing کر کے فضا ہموار کرے، اور نہ ہم خیالوں کا جتھہ بنائے۔ [۱]

۲۔ رائے کا اظہار

جس سطح پر رائے طلب کی جائے، وہاں ہر شخص دیانتداری سے اپنی رائے دے۔ بلا خوف لومتہ لائم۔ کیونکہ کسی شخص کے اندر جو رائے بھی مفادِ دین اور مصلحت مسلمین اور خیر خواہی انسانیت کے لیے پیدا ہو وہ ایک امانت ہے، جو دیانت داری سے ادا کرنی چاہیے۔ اپنی رائے کے حق میں پورے دلائل دیے جائیں۔ امکانی اعتراضات اور متقابل کے شبہات کے بارے میں وضاحتیں کی جائیں۔ پھر جب آدمی یہ حق ادا کرے تو وہ اپنی بڑی ذمہ داری سے فارغ ہوا۔ اب یہ کام متعلقہ فرد، افراد، یا مجلس کا ہے کہ وہ کشادہ دلی سے غور کریں اور استفادہ کریں۔

۱۔ یہ بھی ضروری ہے کہ اصحابِ امر یا اہلِ قیادت یا اکابر عمائد بھی جتھہ بندی کر کے معاملات و امور کو پہلے سے اپنے درمیان طے کرنے سے مجتنب رہیں۔ اکابر اگر اس طریق نجویٰ کو مسلک بنا لیں تو پھر کسی خرابی کا حل نہیں، بلکہ اس سے ہر طرف بگاڑ پھیلے گا۔ ارکان شوریٰ اور عام ارکان کو کڑی نظر رکھنی چاہیے کہ مشورے کے کام میں ایسا نجویٰ وجود میں نہ آ جائے جو معاملات و امور کو بالا تر پہلے ہی سے طے کر دے اور باقی ارکان کا کام صرف انگوٹھا لگانے کا ہو۔ سوچنے سمجھنے کے دروازے بند۔ معصومانہ سازش کے اس راستے سے جمہوری دائرے میں آمریت اور دینی دائرے میں پیری مریدی پیدا ہو جاتی ہے۔

ایک وقت آتا ہے کہ خام اور کھوکھلے لوگ نظم کے اندر زیادہ گھس آتے ہیں۔ وہ نہ اتنا مطالعہ رکھتے ہیں اور نہ اتنا تفکر جس کی مانگ تحریک اسلامی کرتی ہے، لہٰذا ان کے لیے سہل صورت یہ ہوتی ہے کہ دو چار سوچنے والے دماغ سوزی کا کام کر کے پکی پکائی کھیر ان کے سامنے رکھ دیں اور وہ پکار دیں "واہ واہ، ہمارا ووٹ آپ کے ساتھ ہے" "جو رائے امام کی، وہی مقتدی کی" حتیٰ کہ بعض اصحاب تو اب یہ تک چاہتے ہیں کہ مرکز کا یہ اشارہ سمجھ میں آ جائے کہ وہ کس شخص کو اہمیت دے کر آگے کرنا چاہتے ہیں، بس وہ بھی فوراً اسی کے حق میں آواز اٹھا دیں گے۔

۳۔ دانشے برا صوا د سے اجتناب

کسی شخص کو اپنے متعلق عقل کل ہونے کا ادعا اور دوسروں کے مقابلے میں ذہنی برتری کا احساس لاحق نہیں ہونا چاہیے' کہ بس جو کچھ میں نے کہا ہے اسے ضرور مانا جانا چاہیے۔ دوسروں کو بھی حسن نیت سے آراستہ سمجھنا چاہیے' اور تسلیم کرنا چاہیے کہ دوسرے بھی سوچتے ہیں' دوسروں کے اندر بھی اپنی اپنی آراء ابھرتی ہیں' دوسروں کے دلائل بھی قابل توجہ ہوتے ہیں' اور دوسروں سے بھی استفادہ کیا جانا چاہیے۔

۴۔ اجتماعی فیصلہ قبول کرنا

پھر جب ہر طرف سے آراء سامنے آ چکیں تو کسی دینی مشاورتی مجلس کی فضا جو رنگ اختیار کرے' اور ساری مجلس یا اس کی واضح اکثریت جب کسی فیصلے پر پہنچ جائے' تو اجتماعی نقطہ نظر کو اس کشادہ دلی سے قبول کر لینا چاہیے کہ جیسے وہ بھی اپنا ہی فیصلہ ہو۔ ذہن میں اگر کوئی اختلافی رجحان باقی بھی رہے تو اسے اجتماعیت پر قربان کر دینا چاہیے۔

علی الخصوص جب سربراہ کار کی رائے بھی اکثریتی رجحان کے حق میں دو ٹوک طریق سے سامنے آ جائے تو پھر سمع و طاعت اور ہم آہنگی کی ذمہ داری اور بھی شدید ہو جاتی ہے۔

اسلامی اصول مشاورت کے تحت کسی شخص کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ اجتماعی فیصلہ ہو جانے کے بعد پھر اپنی جداگانہ اختلافی رائے کا جھنڈا بلند کرے بلکہ یہ بھی درست نہیں کہ اس کے الفاظ یا رویے سے کسی طرح کی تکدرانہ بد دلی کا اظہار ہو۔

یہ ہے طریقہ تفردات کے فتنے سے بچ کر اجتماعیت کو مستحکم رکھنے کا۔ اگر حل اختلافات کے لیے ایسی کوئی آخری حد معین نہ کی جائے تو پھر آدمی کی اختلاف پسند فطرت نہ کسی اتحاد کو قائم رہنے دیتی ہے' نہ کسی اجتماعیت کو چلنے دیتی ہے۔

یہی تمام مخلص خادمانِ دین کی روش رہی ہے' یہی اسلامی نظامِ جماعت کے دستور کا تقاضا ہے اور یہی ۴۳ سال سے ہماری اٹل روایت رہی ہے۔ اس اصول و روایت میں خلل ڈالنے کے معنی یہ ہیں کہ ہزاروں افراد کی قربانیوں سے اسلامیت کے قلعے کی جو فصیل اٹھائی گئی تھی' اس میں دراڑیں ڈال دی جائیں' اور ساتھ اپنی بنی بنائی ساکھ کو برباد کر دیا جائے۔ محض اپنی "انا" کے سامنے اتنا قیمتی چڑھاوا پیش کر دینا کوئی اچھی بات نہیں۔

سمع و طاعت کہاں تک ؟

یہ محض خود ساختہ مصلحتی باتیں نہیں ہیں' بلکہ معاملے کے ہر پہلو پر الگ الگ دلائل کتاب و سنت میں موجود ہیں۔ ان سارے دلائل کو جو شاید بیشتر نگاہوں سے اوجھل نہیں ہیں' میں یہاں دہرانا نہیں چاہتا' لیکن اسلامی نظام سمع و طاعت کے متعلق متعدد ہم معنی احادیث میں سے صرف ایک کو یہاں نقل کرتا ہوں :

عن جنادۃ بن امیہ' قال : دخلنا علی عبادۃ ابن صامت و ھو مریض' فقلنا حدثنا اصلحک اللہ بحدیث ینفع اللہ بہ سمعتہ من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم' قال' دعانا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فبایعنا ' فکان فیما اخذ علینا ان بایعنا علی السمع والطاعۃ فی منشطنا و مکرھنا و عسرنا ویسرنا واثرۃ علینا ' ولا ننازع الامر اھلہ' قال' الا ان تروا کفرا بواحا " عندکم من اللہ فیہ برھان۔ (مسلم)

روایت جنادہ بن امیہ کی ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہم عبادہ بن صامت کے پاس گئے جو حالتِ مرض میں تھے' پھر ان سے ہم نے کہا کہ اللہ آپ کو شفا دے' ہم سے کوئی حدیث بیان کیجئے جو آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہو اور اللہ اسے باعث افادہ بنا دے۔ انہوں نے جواباً" کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں (بیعت کرنے کے لیے) فرمایا اور ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے جو اقرار لیا' جس پر ہم نے بیعت کی' وہ یہ بات تھی کہ سمع و طاعت کے پابند رہیں' پسندیدہ صورتوں میں بھی اور ناپسندیدہ صورتوں میں بھی' آسانی کی حالت میں بھی اور تنگی کی حالت میں بھی . . . . . اور اس صورت میں بھی کہ ہم دباؤ میں ہوں اور یہ کہ ہم اختیار کے معاملے میں اہلِ اختیار سے نزاع نہ کریں' پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اضافہ فرمایا کہ "الا" یہ کہ تم صریح و نمایاں کفر (کے صدور) کو دیکھو' جس کے متعلق تمہارے پاس اللہ کی طرف سے واضح دلیل موجود ہو۔"

اس حدیث کو پڑھ کر یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ کسی صحیح دینی اجتماعیت کا معاملہ عام سیاسی پارٹیوں کی طرح کا نہیں ہوتا' جو چیز چاہی مان لی' جس معاملے میں چاہا اختلاف کر کے الگ بیٹھ

رہے' دوسروں میں اپنا اختلافی نقطہ نظر پھیلانا شروع کر دیا' بات کو پریس میں لا کر "المجالس بالامانۃ" کی تعلیم کو پامال کر دیا۔ دینی اجتماعیت کے نظام امر اور نظام مشاورت اور حدود اختلاف کی خلاف ورزی گناہ ہے جس کے سرزد ہونے کے بعد توبہ کے علاوہ کوئی راہ نجات نہیں۔

[اس حدیث میں تین اہم امور کی طرف توجہ دلائی گئی ہے:]

۱۔ اطاعت

اس حدیث اور ایسی متعدد احادیث کا مطلب یہ ہے کہ اجتماعی فیصلوں اور اربابِ امر کے احکام کی اطاعت خوش گواری اور ناخوشگواری' آسانی اور تنگی کی مختلف حالتوں میں کی جائے گی۔ بلکہ آدمی جب محسوس کرتا ہو کہ اس کی پرخلوص رائے اور اس کا محکم استدلال دوسروں کی کثرتِ رائے یا صاحبِ امر کے نقطہ نظر کے بوجھ سے دب گیا ہے' تب بھی اسے اطاعت کرنی چاہیے۔ اور ایسا نہیں ہونے دینا چاہیے کہ اس کے رویے' اس کے الفاظ' اس کے لہجے یا چہرے کے رنگ سے بھی دیکھنے والوں کو یہ تاثر ہو کہ اس شخص کو اجتماعی فیصلے یا صاحب امر کے حکم سے کوئی تکدر ہے۔

۲۔ اہلِ امر سے نزاع

دوسری اہم بات اس میں یہ ہے کہ اہل امر سے اختیار چھیننے یا اس اختیار کو کمزور کرنے یا اسے کم اثر بنانے کے لیے بحثا بحثی اور شدت اختلاف اور اظہار رنج اور جتھا بندی کے ذریعے شمہ بھر بھی کوشش نہ کی جائے۔ جو لوگ شریک مشورت ہوتے ہیں وہ بھی "امر" سے ایک گونہ تعلق رکھتے ہیں۔ لہٰذا ان کی اکثریت کو بے وزن اور ناقابل احترام قرار دینا بھی نزاع کی تعریف میں داخل ہے اور سربراہ تو کسی اسلامی نظام جماعت کو چلانے کی آخری ذمہ داری رکھتا ہے اور پوری جماعت کے سامنے سب سے بڑھ کر جوابدہ ہوتا ہے۔ وہ جب رفقائے مشورت کی بحثیں سن کر ان کے غالب رجحان کی بنیاد پر ایک فیصلہ دیتا ہے کہ یہ بات یوں طے ہوئی تو اس بات کو نہ ماننا یا زبان سے مان کر عمل سے اس کا حق ادا نہ کرنا' یا مثبت سرگرمی کے بجائے منفی انداز سے ذہنی برودت کا مظاہرہ کرنا' یہ ساری صورتیں نزاع فی الامر سے تعلق رکھتی ہیں۔

۳۔ حدِ اطاعت

تیسری بات یہ ہے کہ حدیث کی رو سے بگڑ جانے یا تبری کرنے یا مختلف رائے سامنے لانے

کے لیے صرف ایک ہی حتمی بنیاد ہے' اور وہ یہ کہ کھلے کھلے کفر کا صدور اصحاب امر یا ارباب مشورت کی طرف سے ہو' اور کھلے کفر کا اطلاق محض جذبات کی بنیاد پر نہ کیا جائے' بلکہ آدمی کے پاس اللہ کی طرف سے صاف صریح دلیل ہونی چاہیے۔

یہ ہے کسی اسلامی نظام جماعت میں طاعت کی آخری حد۔ اگر لوگ اس آخری حد کے آنے سے پہلے ہی ہر اختلاف پر منہ پھیرلیں تو نتیجہ سوائے اس کے کیا ہو سکتا ہے کہ ایک تیز رو ندی جو چٹانوں کو ریلتی جاتی ہو' کئی دھاروں میں تقسیم ہو جائے' اور چھوٹے چھوٹے دھارے اس قابل بھی نہ ہوں کہ راستے میں جمع ہو جانے والے انبار خس و خاشاک کو بہا لے جا سکیں۔ وہی ندی جسے عبور کرنا جان جوکھوں کا کام تھا' اب اس کے چھوٹے چھوٹے دھاروں اور باریک نالیوں کو بچے بھی الانگنے لگیں گے۔ اختلاف جب اپنی حدود کا پابند نہ رہے تو پھر اجتماعیت کا قائم رہنا ممکن نہیں رہتا۔ سمع و طاعت کے دینی اصولوں اور دیرینہ عملی روایات کو اگر توڑا جانے لگے تو پھر کسی فرد کی بھی سربراہی اور کسی مجلس کی مشاورت کی قوت کام نہ کر سکے گی۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق دے کہ ہم شریعت کے نظامِ سمع وطاعت' اس کے ضابطۂ مشاورت اور اہلِ امر کے حقوق کو اچھی طرح سمجھیں اور ان کو قدم قدم پر ملحوظ رکھیں۔

آمریت سے اجتناب

یہاں دو ایک وضاحتیں ضروری ہیں۔ اصولی بات تو بیان ہو گئی' مگر ہماری دینی کوششوں کے لحاظ سے ذہنی جھکاؤ حفاظت نظم کی طرف زیادہ ہے' اور فرد اور معاشرے کے حقوق نسبتاً کمزور حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ خلافت راشدہ تک جو دور اقتدار چلا وہ عوامی رجحانات اور مشاورتی تقاضوں کے حدود میں کسا رہا۔ لیکن یہ نظام چونکہ اخلاقی ساخت رکھتا ہے اس لیے امیر کو جو اختیارات حاصل ہوتے ہیں' ان پر وہ تنقیدوں سے چاہے تو زیادہ اثر نہ لے' اور مشاورت کے لیے بھی اپنی پسند کے افراد کو جمع کر لے' اور جدھر سے اختلافی اور احتسابی بات اٹھ سکتی ہو ایسے لوگوں کو دور پھینک سکتا ہے' یا ان کی بات کو ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑا سکتا ہے' اور یوں آہستہ آہستہ آمریت کا راستہ بنتا ہے۔ میرا مطالعہ احادیث ناقص ہے' مگر اتنا تاثر ۔ نے لیا ہے کہ نظامِ اسلامی کا نام لیتے ہوئے اگر کوئی شخص ایک آمری شخصی نظام کی طرف گاڑی کو موڑنے پر اتر آئے تو یہ پورے دین اور پوری ملت کا بھاری نقصان ہے۔ اس

نقصان کو دور کرنے کے لیے زبان اور قلم کی طاقت جائز طریق ہے اور مختلط انداز سے استعمال کرنا لازم ہے۔ پھر اگر معاشرے کا درستی احوال کے لیے عام تقاضا پیدا ہو جائے تو وہ اپنے راستے خود بناتا رہتا ہے۔

میرے نزدیک کسی کی انسانی اطاعت کو خدا کے حکم کے تحت لا کر جب اطاعت بالمعروف کہا جاتا ہے تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ کوئی اطاعت معروف کو قائم کرنے اور منکر کو توڑنے والی ہو' اور وہ مجموعی مصلحت دین اور مجموعی امت کے لیے باعث ضرر نہ ہو۔

یہ ہو سکتا ہے کہ آدمی بعض فیصلوں کی عملاً یا قولاً" مخالفت نہ کرے' جب تک کہ وہ صریحاً" قانونِ شریعت اور اخلاقِ اسلامی کے مخالف نہ ہوں' مگر بعض فیصلوں کے خلاف اس کے دل میں کوئی دوسرا نقطہ نظر ہو سکتا ہے۔ کوئی شخص ضمیر کو بالکل کچل نہیں سکتا' اور ایسے نقطہ ہائے نظر کو مصلحتاً اگر روکنا پڑے تو نظم کی خاطر وہ روکے ضرور جا سکتے ہیں' مگر کبھی کبھار گفتگوؤں' تقریروں' تحریروں میں نہایت خفیف درجے میں جھلک بھی سکتے ہیں۔ یہ کمزور انسان کی فطرت کی مجبوری ہے۔

اگر کوئی اقتدار' یا جماعت' لوگوں کو ایسی بہت سی پیچیدگیوں میں آئے دن مبتلا کرتی رہے' اور ان کے اضطراریات کا لحاظ کیے بغیر اپنی مرضی اپنے حامیوں کے تعاون سے ٹھونستی چلی جائے' تو آہستہ آہستہ انتشار اور بحران کی وبا پھیلتی جاتی ہے' اور ایک وقت آتا ہے کہ نہایت اچھے بنے بنائے کارکنوں کے خیالات کو صحیح پٹڑی پر ڈالنا مشکل ہو جاتا ہے۔

لہٰذا اطاعت کرانے کی ذمہ داری جن لوگوں پر عائد ہوتی ہے' ان کا کام یہ ہے کہ ان شرائط کو ضرور پورا کریں جن سے رضاکارانہ جذبہ اطاعت بڑھتا ہے۔ یہ دو طرفہ کام ہے۔ اگر حالات میں خلل ہو گا تو ذمہ داری دونوں طرف تقسیم ہو گی۔ کسی ایک فریق کو پاک صاف قرار نہیں دیا جا سکتا۔

واضح رہے کہ نبیؐ کی قیادت اور خلفائے راشدینؓ کی قیادت اور دوسرے صلحاء کی قیادت کو بربنائے عدالت و دیانت اور بربنائے محبت فرد و محبت ملت نیز اپنے رتبہ عوامیت اور اہتمام مشاورت کی وجہ سے جو محکم اعتماد حاصل رہتا ہے' ضروری نہیں ہوتا کہ وہ اعتماد پورے معیار کے ساتھ یا ایک بڑی حد تک ہر جگہ موجود ہو۔ اس روح و جوہر میں اگر کمی ہو تو باقی صرف دستور اور ضابطے اور سرکلر اور فلاں مجلس اور فلاں مجلس کے فیصلے رہ جاتے ہیں۔ ہر قیادت کی اصل قوت' محبت و اعتماد ہے'.. نہ کہ تحکم و جلال !

یہ چند سطور میں نے اس شعور کی روشنی میں لکھی ہیں جو تاریخ اور اجتماعی ہیئتوں میں کام کرنے والے قانون کے متعلق مجھے حاصل ہو سکا ہے۔

(تحریکی شعور، ۱۹۸۹ء، ص ۳۰۱ تا ۳۱۱)

د۔ اختلافات کے باوجود اتحاد

مسلمانوں کی بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ وہ اسلام کے لیے کام کرنے کو بار بار اٹھتے اور جمع تو ہوتے ہیں، لیکن ذرا ذرا سے اختلافات پر آپس میں ٹوٹ جاتے ہیں۔ پھر آگے چلتے ہیں، پھر اختلافات کی چھری ایک ٹکڑی کو کاٹ کر الگ کر دیتی ہے۔ جماعتیں بن بن کر بکھر جاتی ہیں۔ اتحاد قائم ہوتے ہیں اور نیست و نابود ہو جاتے ہیں۔ قائم و دائم ہے تو وہ ہے تفرقہ!

مصیبت اصلاً یہی ہے کہ "اختلافات کے باوجود اتحاد" کی صف بنانا اور اسے قائم رکھنا ہمیں نہیں آتا۔ ہم اختلافات سے عہدہ برا ہونے کی صحیح ترکیب نہیں جان سکے ہیں۔ خدا و رسولؐ کے جس دین کی سربلندی کا مشن لے کر اٹھے ہیں، اس نے آداب اختلاف اور طریقہ ہائے حل نزاع بھی ہم کو بتائے تھے۔ ان کو ہم جانتے بھی ہیں، مگر عملاً جب اختلافات کی آزمائش پیش آتی ہے تو وہ طریقے فراموش ہو جاتے ہیں۔ ہمارے قریبی بزرگ اور ساتھی جن کو اختلافات و نزاعات کے حل کے لیے غیر جانبدارانہ انداز سے کام کرنے کو موجود ہونا چاہیے، وہ وقت پر خود جانبدار بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں، اور اپنے مرتبہ قیادت اور دانشوری کے باوجود خادمان دین کو اختلافات سے پیدا ہونے والے خطروں سے نہیں بچا سکتے۔

جس دن اس مسئلے کا حل مسلمانان عالم نے نکال لیا، اس دن کوئی مزاحمت ہمارے سامنے کھڑی نہ رہ سکے گی اور اس مدعا کے لیے فکری اور عملی رہنمائی بہم پہنچانا تحریکِ اسلامی پر بدرجہ اشد لازم ہے۔ اس دور کا سب سے مشکل کام یہی ہے!

(تحریکی شعور، ۱۹۸۹، ص ۳۰۰)

طبقۂ مترفین اور اسلام کا نظامِ عدل

مولانا گوہر رحمٰن

(۵)

دوسری خامی یہ ہے کہ اصولِ تجارت اور کارخانوں کی مصنوعات سے زکوٰۃ وصول نہیں کی جاتی، کہ یہ سب بھی اموالِ ظاہرہ میں شامل ہیں، اس لیے کہ اموالِ ظاہرہ کی تعریف میں ہر وہ مال شامل ہے جس کا علم اور حساب حکومت کے لیے ممکن ہو۔ فقہاءِ کرامؒ نے اموالِ ظاہرہ کی جو مثالیں دی ہیں یعنی زمینوں اور باغات کی پیداوار، مویشی اور وہ اموالِ تجارت جو ایک شہر سے دوسرے شہر میں یا ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں لائے جاتے ہیں، تو یہ مثالیں اس دور کی ہیں جس میں بنکوں، کارخانوں اور تجارتی اداروں کے اموال حکومت سے پوشیدہ نہیں رہ سکتے۔ جب ٹیکسوں کی وصولی کے لیے حکومت حسابات معلوم کر سکتی ہے، تو زکوٰۃ کے لیے کیوں یہ معلومات حاصل نہیں کر سکتی۔ سرمایہ دار اور صنعت کار اپنی قارونی طبیعت کی وجہ سے کچھ ہیر پھیر تو کرلیں گے لیکن سارا مال تو نہیں چھپا سکیں گے اور اگر حکومت خود سرمایہ داروں کی نہ ہو بلکہ عادل حکومت ہو، تو سرمایہ داروں کے ہیر پھیر اور حسابی چکر کا علاج بھی کر سکے گی۔ اگر بالفرض تسلیم بھی کر لیا جائے کہ تاجروں اور صنعت کاروں کے اموال، اموال باطنہ ہیں تو فقہاءِ کرام نے یہ بھی لکھا ہے کہ اگر حکومت یہ محسوس کرے کہ لوگ اپنے اموالِ باطنہ کی زکوٰۃ ادا نہیں کرتے تو اس صورت میں حکومت کے کارندے اموالِ باطنہ کی زکوٰۃ بھی قانوناً" وصول کرنے کے لیے مناسب اقدامات کر سکتے ہیں۔ (بدائع الصنائع، ج ۲ ص ۷)

تیسری خامی یہ ہے کہ جو تھوڑی بہت زکوٰۃ و عشر کی رقم وصول ہوتی ہے اس کی تقسیم صحیح نہیں ہوتی۔ زکوٰۃ کمیٹیوں کے ممبران اور ان کے چیئرمینوں کی تقرری میں حکومت خود اپنے اعلان کردہ قواعد کی پابندی نہیں کرتی۔ بالعموم ضلعی انتظامیہ کے ذریعے سیاسی وفاداریوں کی بنیاد پر

تقرریاں کر دی جاتی ہیں۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بدنام اور بد دیانت لوگوں کے ہاتھوں میں زکوۃ و عشر کی رقوم آجاتی ہیں اور مستحقین تک ان کا حق پہنچ نہیں سکتا۔ "عاملینِ زکوۃ" کا منصب بڑا مقدس منصب ہے۔ اس کے لیے مسلمان ہونے اور دیانت دار ہونے کے ساتھ بقدر ضرورت زکوۃ کے مسائل سے واقف ہونا بھی ضروری ہے۔

اسلامی معیشت میں زکوۃ و عشر کا یہ سارا نظام اجتماعی تکافل ہی کے لیے ہے' اس کے مصارف بھی معاشرے کے محتاج لوگ اور جہاد ہیں۔ زکوۃ کے علاوہ فطرانہ (صدقہ فطر)' نذر' روزے کا فدیہ' قسم توڑنے کا کفارہ (دس مسکینوں کو کھانا کھلانا)' بیوی کو ماں سے تشبیہ دینے یعنی ظہار کا کفارہ (ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا)' اور حج و عمرہ کی جنایات کے مالی کفارے بھی وہ مالی واجبات ہیں جن کے مصارف وہی ہیں جو زکوۃ کے ہیں۔

ب۔ "عوامی حاجت" پوری کرنے کے لیے زکوۃ کے علاوہ مال بھی قانوناً لیا جا سکتا ہے

اگر زکوۃ اور دوسرے مالی واجبات کا نظام پوری طرح اور صحیح طریقے پر نافذ ہو جائے تو عام حالات میں مزید مال اغنیاء سے زبردستی لینے کی ضرورت نہیں پڑے گی' بالخصوص جب کہ خاندانی تکافل یعنی نفقۃ الاقارب کا نظام بھی موجود ہو لیکن پھر بھی حوادث اور آفاتِ سماویہ اور قحط سالی کے مواقع پر مزید اموال کی ضرورت پیش آ سکتی ہے۔ ایسی صورتِ حال میں بقدرِ ضرورت اور بوقتِ ضرورت (مستقل طور پر نہیں) زکوۃ کے علاوہ مال بھی قانوناً اغنیاء پر عائد کیا جا سکتا ہے۔ اس کے دلائل کا خلاصہ پیش خدمت ہے۔

آیاتِ قرآنیہ

سورۃ بقرہ کی آیت ۱۷۷ میں سچے مومنوں اور متقیوں کی صفات بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا

وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ (البقرۃ ۲: ۱۷۷)

اور مال دے اللہ کی محبت میں اپنے رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں اور مدد مانگنے والوں کو اور خرچ کرے غلامی سے لوگوں کی گردنیں چھڑانے میں اور نماز قائم کرے اور زکوۃ ادا کرے۔

اس آیت میں مال دینے کا ذکر زکوۃ دینے کے ذکر سے قبل ہوا ہے اور زکوۃ کا ذکر اس کے بعد الگ ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ اتی المال اور اتی الزکوۃ کا ایک ہی آیت میں الگ الگ ذکر ان دونوں مالی حقوق کے الگ الگ ہونے کی طرف واضح اشارہ ہے۔ اس آیت کا حوالہ حدیث میں بھی دیا گیا ہے'

فاطمہ بنت قیسؓ کہتی ہیں کہ میں نے رسول اللہؐ سے زکوۃ کے بارے میں پوچھا تو آپؐ نے فرمایا مال میں زکوۃ کے علاوہ بھی حق ہے اور سورہ بقرہ کی یہ آیت پڑھی کہ "لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوا" ..... (سنن ترمذی کتاب الزکوۃ 'سنن داری کتاب الزکوۃ)

حضرت عبد اللہ بن عمرؓ' عامر شعبیؒ' ابراہیم نخعیؒ' مجاہد بن جبرؒ' عطاءؒ اور حسن بصریؒ سے بھی مروی ہے کہ مسلمانوں کے مال میں زکوۃ کے علاوہ حق ہے (مصنف ابن ابی شیبہ کتاب الزکوۃ باب فی المال حق سوی الزکوۃ ج ۳ ص ۱۹۱ الناسخ والمنسوخ لابی عبیدؒ طبع ریاض ۱۹۹۰ء ص ۳۶-۳۷)

امام المفسرین ابن جریر طبری (م ۳۱۰ھ) لکھتے ہیں :

جب اس آیت میں وآتی المال کے بعد وآتی الزکوۃ کا ذکر دوبارہ کیا گیا ہے تو اس سے ہمیں معلوم ہوا کہ یہ حق مالی زکوۃ کے علاوہ ہے اگر دونوں سے زکوۃ ہی مراد ہوتی تو پھر ایک آیت میں اس تکرار کی کوئی معقول وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ (تفسیر ابن جریر ج ۲ ص ۹۸)

قاضی ابن عربیؒ نے اس حدیث سے استدلال کرتے ہوئے لکھا ہے :

جب زکوۃ ادا کر دی جائے' اس کے بعد کوئی ضرورت در پیش ہو تو اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے مزید مال خرچ کرنا بالاتفاق واجب ہے (احکام القرآن ج ۱ ص ۸۸)

امام جصاصؒ' امام رازیؒ اور امام قرطبیؒ نے بھی اس آیت سے استدلال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ضرورت کے وقت مسلمانوں کے اموال میں زکوۃ و عشر کے علاوہ مالی حقوق عائد کیے جا سکتے ہیں۔

اس آیت کے علاوہ قرآن کریم کی متعدد دوسری آیات میں رشتہ داروں' یتیموں' مسکینوں' مسافروں' ہمسایوں' اور غلاموں کے ساتھ احسان کرنے' ان کو کھانا کھلانے اور ان کے حقوق ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے' اور ان حقوق کے ادا نہ کرنے والوں کے لیے وعید آئی ہے۔ ان آیات میں ایسا کوئی لفظ نہیں آیا جس سے معلوم ہوتا ہو کہ یہ احسان صرف زکوۃ کے ذریعے کیا جائے گا' بلکہ عمومی الفاظ میں کہا گیا کہ نادار لوگوں کی ضرورت پوری کرو' خواہ زکوۃ سے پوری کی جائے یا

مزید مل سے پوری کی جائے ۔ فاطمہ بنت قیسؓ کی مذکورہ حدیث کو اگرچہ ترمذی اور دوسرے محدثین نے ضعیف کہا ہے ' اس لیے کہ اس کی سند میں ابو حمزہ میمون الاعور آیا ہے جو ضعیف ہے' لیکن باوجود ضعیف کہنے کے امام ترمذی نے اس حدیث کو زکوٰۃ کے علاوہ دوسرے حقوق کے واجب ہونے کے لیے بطور دلیل پیش کیا ہے ۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ قرآن کریم میں اس مفہوم کی آیات آئی ہیں جن سے فاطمہ بنت قیس کی مذکورہ حدیث کی تائید ہوتی ہے۔ چند آیات حسب ذیل ہیں :

۱- اور ان کے مالوں میں حق ہے سائل کا اور محروم کا (الذاریات ۵۱ : ۱۹)

۲ - اور وہ جن کے مالوں میں معلوم حق ہے سائل کا اور محروم کا (المعارج ۷۰ : ۲۵)

ام المومنین عائشہؓ فرماتی ہیں کہ محروم وہ ہے جسے کوئی کسب اور روزگار میسر نہ ہو۔ ابو قلابہ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ یمامہ میں سیلاب آیا اور ایک شخص کا مال بہا کر لے گیا' اس موقع پر ایک صحابیؓ نے فرمایا کہ یہی شخص محروم ہے (تفسیر ابن کثیر)

امام ابن جریرؒ نے محروم کی تفسیر میں صحابہؓ و تابعینؒ کے اقوال نقل کرنے کے بعد ان سب اقوال کا خلاصہ اس طرح بیان کیا ہے کہ جس کے پاس اپنی ضرورت پوری کرنے کے لیے نہ مال موجود ہو اور نہ روزگار موجود ہو تو ایسے شخص کو محروم کہا جاتا ہے (تفسیر ابن جریر)

۳ - دے دو رشتہ دار کو اس کا حق اور مسکین کو اور مسافر کو (بنی اسرائیل ۱۷ : ۲۶)

۴ - اور ماں باپ ' یتیموں ' مسکینوں' قریبی ہمسائے اور دور کے ہمسائے کے ساتھ احسان کرو (النساء ۴ : ۳۶)

۵ - کس چیز نے داخل کرایا ہے تمہیں دوزخ میں' وہ کہیں گے کہ ہم نماز نہیں پڑھتے تھے اور مسکین کو کھانا نہیں کھلاتے تھے (المدثر ۷۴ : ۴۳ تا ۴۶)

احادیثِ نبویہؐ

درج بالا آیات اور اس مضمون کی متعدد دوسری آیات میں نادار لوگوں کی مالی کفالت کا حکم دیا گیا ہے اور یہ ان کا حق قرار دیا گیا ہے ' اس حق کے ادا نہ کرنے والوں کو وعید سنائی گئی ہے۔ یہی تاکیدی احکام ' احادیثِ نبویہؐ میں بھی آئے ہیں۔ چند احادیث درج ذیل ہیں :

"قیدی آزاد کراؤ ' بھوکے کو کھانا کھلاؤ ' اور بیمار کی خبر گیری کرو" (بخاری فی الجہاد)

"وہ شخص مومن نہیں ہے جو اپنا پیٹ بھر چکا ہو اور اس کا ہمسایہ بھوکا ہو" (الادب المفرد للبخاری)

"جس علاقے میں صبح کوئی بھوکا اٹھا تو اس علاقے کے لوگوں سے اللہ بیزار ہے" (مسند احمد دار صادر' ج ۲ ص ۳۳)

"جس کے پاس ضرورت سے زائد سواری ہو تو اسے اس شخص کو دے دے جس کے پاس سواری نہ ہو اور جس کے پاس ضرورت سے زائد سفر خرچ ہو تو اسے اس شخص کو دے دے جس کے پاس سفر خرچ نہ ہو" (صحیح مسلم فی اللقطۃ)

حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ رسولؐ اللہ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مالدار مسلمانوں پر فقراء کی ضرورت کے مطابق مال دینا فرض کر دیا ہے (اتنی مقدار فرض کر دی ہے جس سے ان کی ضرورت پوری ہوتی ہو) فقراء کبھی مشقت میں نہیں پڑتے جب کہ وہ بھوکے ہوں یا ننگے ہوں' مگر ان کے مال داروں کے جرم کی وجہ سے اس مشقت میں مبتلا ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سے سخت حساب لے گا اور ان کو دردناک عذاب دے گا۔ (الروض الدانی الی المعجم الصغیر للطبرانی ج ۱ ص ۲۷۵' الترغیب للمنذری ج ۱ ص ۵۳۸' مجمع الزوائد للھیثمی ج ۳ ص ۶۲)

امام بیہقیؒ اور ابن حزمؒ نے اس کو حضرت علیؓ کا قول قرار دیا ہے مگر درج بالا روایت سے معلوم ہوا کہ یہ اصل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

ان احادیث میں بھوکوں اور بنیادی حوائج سے محروم لوگوں کو کھانا کھلانے اور ان کی ضرورت پوری کرنے کا حکم دیا گیا ہے' اور ان کا حق ادا نہ کرنے والوں کو شدید عذاب کی وعید سنائی گئی ہے۔ حضرت علیؓ کی روایت سے تو ثابت ہوتا ہے کہ ہر علاقے کے اغنیاء پر اس علاقے کے فقراء کا روٹی کپڑے کا انتظام کرنا اللہ نے فرض کر دیا ہے۔ ان احادیث میں بھی ایسا کوئی قرینہ مذکور نہیں ہے جس سے معلوم ہوتا ہو کہ یہ احکام زکوٰۃ ہی سے متعلق ہیں۔ زکوٰۃ سے عوام کی ضرورت پوری ہو گئی ہو تو فبھا' اور اگر مزید دینے کی ضرورت ہو تو مزید دینا واجب ہو جائے گا۔

سنتِ خلافتِ راشدہ

عام الرمادۃ' یعنی قحط سالی کے سال میں حضرت عمرؓ نے زرخیز علاقوں سے اونٹ' گندم اور زیتون منگوا کر دیہات کے لوگوں کی مدد فرمائی تھی' یہاں تک کہ زرخیز علاقے اس امداد کے بوجھ سے تنگ آگئے تھے۔ مگر پھر بارش ہو گئی' اور فراخی آگئی۔ اس موقع پر حضرت عمرؓ نے فرمایا' "اللہ کی قسم! اگر اللہ اس مصیبت کو دور نہ فرماتا تو میں ہر مالدار اور خوشحال گھرانے کے افراد کی تعداد کے برابر فقراء کو ان کے ساتھ شامل کر دیتا۔ اس لیے کہ اگر ایک آدمی کے کھانے

پر دو آدمی گزارہ کر لیں تو ان میں سے کوئی بھی بھوک سے ہلاک نہیں ہو گا۔" (الادب المفرد للبخاری باب المواسات)

ابن سعدؒ نے حضرت عمرؓ کا قول اس طرح نقل کیا ہے:

اگر مجھے اتنا مال نہ ملتا جو لوگوں کی ضرورت پوری کرتا، اور لوگوں کی حاجت پوری کرنے کے لیے اس کے سوا اور کوئی صورت نہ ہوتی کہ ہر گھرانے میں اس کے افراد کے برابر دوسرے افراد داخل کر دوں تاکہ وہ سب آدمی آدمی خوراک تقسیم کر کے کھائیں یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ بارش برسا دے، تو میں ایسا ہی کرتا کیونکہ لوگ آدھا پیٹ کھانے سے ہلاک نہیں ہوتے۔(طبقات ابن سعد، ج ۳، ص ۳۱۶)

سنتِ فاروقی سے ثابت ہوتا ہے کہ عوام کی بنیادی ضرورت پوری کرنے کے لیے لوگوں کو حکم بھی دیا جا سکتا ہے کہ تم اپنا آدھا آدھا کھانا دوسرے بھوکے کو دے دو اور آدھا خود کھا لو۔ حضرت عمرؓ نے جب لوگوں سے اونٹ اور گندم منگوائی تو کسی نے بھی یہ اعتراض نہیں کیا کہ زکوٰۃ تو ہم دے چکے ہیں، یا زکوٰۃ ہم پر ابھی فرض ہی نہیں ہوئی، تو یہ مال ہم سے کیوں لیا جا رہا ہے۔

فقہاءِ اسلام کے اقوال

قرآن کی آیات، رسولؐ اللہ کے ارشادات اور خلافت راشدہ کی سنت کی بنا پر تقریباً تمام فقہا متفق ہیں کہ عوامی حاجت کے وقت لوگوں کی بنیادی ضرورت پوری کرنا اغنیاء پر فرض کفایہ ہے، اور حکومت کو یہ حق حاصل ہے کہ لوگوں کا یہ حق جبراً اور قانوناً وصول کر کے عوام کی ضرورت پوری کرے۔ اس لیے کہ ہر واجب و فرض کی ادائیگی پر حکومت لوگوں کو مجبور کر سکتی ہے اگرچہ وہ زکوٰۃ و عشر کے علاوہ ہو۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ زائد از زکوٰۃ مال بغیر عوامی ضرورت کے عائد نہ کیا جائے، جب ضرورت پیش آجائے تو بقدر ضرورت لے لیا جائے، اور جب ضرورت پوری ہو جائے تو عائد کردہ مال کی وصولی ختم کر دی جائے۔ امام ابوبکر جصاص رازیؒ (م ۳۷۰ھ) فرماتے ہیں:

"مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی حق ہے"۔ اس حدیث کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ذی رحم رشتہ داروں کا نفقہ مراد ہو، جو حاجتمند ہوں اور کمانے کے قابل نہ ہوں۔ والدین اور دوسرے محارم کے اس نفقے کی مقدار کا تعین قاضی کرے گا۔ اور یہ بھی

ہو سکتا ہے کہ اس سے بھوکے اور اضطراری حالت میں مبتلا شخص کو کھانا کھلانا مراد ہو جو واجب ہے۔ (احکام القرآن' ج ۱ ص ۱۳۲)

امام غزالیؒ (م ۵۰۵ھ) لکھتے ہیں:

جب مسلمانوں پر قحط سالی اور خشک سالی آجائے اور لوگوں کا کوئی گروہ مرنے کے قریب پہنچ چکا ہو تو اغنیاء پر ان کی بھوک مٹانے کی حد تک خرچ کرنا فرض ہو جاتا ہے۔ (الملکیۃ فی الشریعۃ' ڈاکٹر عبد السلام عبادی' ج ۳' ص ۸۲' بحوالہ شفاء العلیل' ص ۲۴۲)

قاضی ابوبکر ابن عربی (م ۵۴۳ھ) لکھتے ہیں کہ:

جب مسلمانوں کو زکوٰۃ کی ادائیگی کے بعد کوئی حاجت درپیش ہو تو اس حاجت کو پورا کرنے کے لیے مزید مال خرچ کرنا علماء کے متفقہ فیصلے کے مطابق واجب ہے (احکام القرآن' ج ۱' ص ۸۸' ومثلہ فی القرطبی' ج ۲ ص' ۱۴۲)

امام فخرالدین رازیؒ (م ۶۰۶ھ) فرماتے ہیں:

اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ جب لوگوں کی حاجت ضرورت کی حد تک پہنچ گئی ہو تو لوگوں پر زکوٰۃ کے علاوہ بھی بقدر حاجت مال دینا واجب ہو جاتا ہے' اور اگر لوگ دینے سے انکار کریں تو حکومت ان سے یہ مال بقدر ضرورت زبردستی بھی لے سکتی ہے (تفسیر کبیر' ج ۵' ص ۴۴ - ۴۵' ومثلہ فی روح المعانی' ج ۲' ص ۴۷)

علامہ رملیؒ شافعی فرض کفایہ کی مثالیں بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

مسلمانوں اور ذمیوں کی تکالیف رفع کرنا فرضِ کفایہ ہے۔ مثلاً ننگے آدمی کو کپڑے دینا' تاکہ وہ ستر عورت کر سکے اور گرمی سردی کے مضر اثرات سے اپنے جسم کو بچا سکے' اور بھوکے کو کھانا کھلانا' جب کہ یہ تکلیفیں زکوٰۃ کے مال سے اور بیت المال کے مصالح عامہ کے مال سے رفع نہ ہو سکتی ہوں۔ (نہایۃ المحتاج للرملی' کتاب الجھاد' ج ۸ ص ۴۶)

مذکورہ آیات' احادیث' سنتِ عمر فاروقؓ اور اقوالِ فقہا سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ معاشرے کے نادار اور بنیادی ضرورت سے محروم لوگوں کی کفالت کے لیے بوقت ضرورت اور بقدر ضرورت زکوٰۃ کے علاوہ بھی مال "قانوناً" لیا جا سکتا ہے۔

(جاری ہے)

آبادی میں ردوّبدل ----- نو آبادیاتی پالیسی

مرزا محمد الیاس

(دوسری اور آخری قسط)

یورپی مورخین جب الجزائر کی مقامی آبادی کا ذکر کرتے ہیں تو تمام تر حمایت کے باوجود ان کا مسلم دشمن رویہ چھپا نہیں رہتا۔ وہ مسلمانوں کی تعداد کو کم ظاہر کرنے کے لیے مقامی آبادی کو نسلی بنیاد پر تقسیم کرکے پیش کرتے ہیں ایک نسلی طبقے کو مسلمان قرار دے کر باقی سب کے بارے میں خاموشی اختیار کرتے ہیں، مثال کے طور پر نیگرو آبادی کے مذہب کے بارے میں یہ مورخ کوئی رائے نہیں دیتے حالانکہ یہ سب مسلمان ہیں۔ جے آرموریل نے بھی ایسا ہی کام کیا ہے اس کے مطابق مقامی آبادی کی صورت حال یوں تھی۔ (۸)

صوبے	مسلمان	نیگرو	یہودی	قبائلی آبادی
الجزیرہ	۲۷٬۷۷۳	۱۷۱۴	۷۲۸۹	۴٬۹۰٬۱۶۸
اوران	۱۴٬۳۵۰	۱۵۳۱	۷۷۴۹	۴٬۷۷٬۰۳۴
قسطنطنیہ	۲۰٬۸۰۵	۹۳۲	۳۹۹۰	۱٬۰۱۶٬۷۱۶
میزان	۶۰٬۹۲۸	۳۱۷۷	۱۹۰۲۸	۱۴٬۸۳٬۹۱۸

ان مؤرخین کے مطابق مقامی آبادی میں سے صرف عرب مسلمان تھے اور دیگر تمام اقوام کا مذہب اسلام نہیں تھا۔ اس سے بڑا ظلم کیا ہو سکتا ہے کہ آبادی کے اعداد و شمار میں ہی کسی ملک کی اصل شناخت کو کم کر دیا جائے اور جو کچھ نہیں ہے اسے حقیقت کا روپ دے کر سامنے لایا جائے۔

اسی طرح کا ایک اور کارنامہ ۳۱ دسمبر ۱۸۵۲ء کو ہونے والی مردم شماری کے اعداد و شمار تھے۔ ان اعداد و شمار میں الجزائر کی قبائلی اور دیہی آبادی کو بالکل الگ تھلگ کرکے صرف شہری آبادی کے اعداد و شمار کی بنیاد پر مذاہب اور تصورات کی تقسیم کی گئی ہے۔ اس مردم شماری میں کہا گیا

8 - Ibid - Page 353

ہے کہ الجزائر کی آبادی ۱۹٬۸۳٬۹۱۸ سے بڑھ کر ۲۲٬۳۰٬۳۴۹ ہو گئی یعنی اس میں ۲٬۴۶٬۴۳۱ نفوس کا اضافہ ہوا۔ ان نفوس کو اس مردم شماری میں یوں بیان کیا گیا ہے۔

یورپی باشندے	۲۲۴٬۴۰۱
مقامی باشندے	۲۲٬۰۳۰
کل	۲۴۶٬۴۳۱

یورپی باشندوں میں اقوام کی بنیاد پر تقسیم یوں تھی۔

فرانسیسی	۶۹٬۹۸۰	ہسپانی	۳۵٬۱۳۹
اطالوی	۷٬۳۰۸	مالٹا	۵۶۰۹
جرمنی	۳۰۲۵	سوس	۱۲۲۲
بلجیم اور ہالینڈ	۵۲۶	آئرش	۲۸۳
پولش	۲۵۸	پرتگالی	۱۳۵
دیگر	۵۱۵		

ان میں سے ۲۹٬۴۵۱ مرد، ۲۸٬۲۳۲ عورتیں، ۳۰٬۰۷۳ لڑکے اور ۳۴٬۶۳۵ لڑکیاں تھیں۔

یورپی اقوام کی تفصیلات کے علاوہ ان کا مذہب بھی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے جس کے مطابق ان میں سے رومن کیتھولک عیسائیوں کی تعداد ۲٬۲۱٬۲۲۶ پروٹسٹنٹ عیسائیوں کی تعداد ۲۵۶۲، اسرائیلی ۶۱۳ تھے۔ ۳۴٬۸۲۶ خاندانوں پر مشتمل یہ غیر ملکی الجزائر کے شہروں میں ۸۰٬۱۴۳ اور دیہی علاقوں میں ۴۴٬۲۵۸ کی تعداد میں موجود تھے۔

موجودہ الجزائر میں ۹۸ فیصد مسلمان ہیں جبکہ دیگر مذاہب اور طریقہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے لوگوں کا تناسب صرف ۲ فیصد ہے۔ مختلف شہروں میں مسلمانوں کی آبادی یہ ہے۔(۹)

الجزیرہ	۱۷٬۲۴٬۶۰۷
قسطنطینہ	۴٬۳۸٬۵۷۸
وطہ	۳٬۳۸٬۳۳۲
بلیدہ	۱٬۹۴٬۳۱۴
سطیف	۱٬۸۶٬۹۷۸
سیدی بالعباس	۱٬۸۴٬۹۷۸

9 ـ مسلم دنیا، فیض احمد شہابی، شائع کردہ ادارہ معارف اسلامی منصورہ، لاہور ـ جولائی ۱۹۹۰ء

تلمسان	۱،۳۶،۰۸۹
سکیکدہ	۱،۳۱،۱۵۹
بجایہ	۱،۲۳،۱۳۲
تبسہ	۱،۲۲،۷۸۸
الاصنام	۱،۱۸،۹۹۶
تیزی اوزو	۱،۰۰،۷۳۹
میدی	۸۴،۲۹۲

الجزائر میں اسلامی قوتوں کے غالب آنے کی وجوہات میں آبادی پر دباؤ، ان کے مذہب کے ساتھ امتیازی سلوک، سماجی ڈھانچوں کی مسلسل شکست و ریخت اور معاش کے ذرائع پر کنٹرول کے سال ہا سال عمل نے بھی نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ آباد کاروں نے نئی بستیاں بناتے ہوئے مساجد اور دینی مراکز کو بھی تہہ تیغ کر دیا تھا۔ الجزائر کی آبادی کے ساتھ غیر ملکیوں کے حسن سلوک نے واضح کر دیا تھا کہ آزادی کے بعد بھی ان کا اثر و رسوخ اور عمل دخل جاری رہے گا اور غلامی سے نجات کا واحد راستہ یہی ہے کہ اسلام کی طرف مکمل مراجعت کی جائے۔

آبادی پر شدید دباؤ کے اثرات کے بارے میں پہلے گفتگو ہو چکی ہے۔ فرانس کی یہ مکمل کوشش رہی کہ وہ آبادی میں تبدیلی، مسلمانوں کی اصل تعداد کے بارے میں صحیح اعداد و شمار کو چھپانے اور انہیں گروہی اور نسلی قومیتوں کی حیثیت سے متعارف کرانے کا راستہ اختیار کرکے یہ جواز فراہم کر سکے کہ آبادی اور مذہب کے اعتبار سے الجزائر اس کا حصہ ہے، لیکن الجزائر کے مسلمانوں کے شعور نے ان کوششوں کو ناکام بنایا اور آزادی کی راہ پر کامیابی سے گامزن رہے۔ یہ سفر آج بھی جاری ہے۔ جس کی منزل الجزائر کے اسلامی تشخص کی مکمل بحالی ہے۔

رسائل و مسائل

ملک غلام علی

نقد اور ادھار قیمت میں تفاوت

سوال :

ایک مسئلہ کے بارے میں دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ شرعی حکم کیا ہے ؟

ہمارے ایک رکنِ جماعت سوت بیچتے ہیں ۔ نقد مال فروخت کیا جائے تو ایک قیمت لیتے ہیں' اگر خریدار ادائیگی ایک ماہ بعد کرنے کا وعدہ کرے تو اس سے نقد والی قیمت سے کچھ زیادہ وصول کرتے ہیں ۔

رسائل و مسائل حصہ اول ص ۳۲۱ پر یہ عبارت ہے :

سوال : اگر کوئی دوکاندار اس اصول پر عمل پیرا ہو کہ وہ نقد خریدنے والے گاہک سے اشیاء کی کم قیمت لے اور ادھار لینے والے سے زیادہ تو کیا وہ سود خوری کا مرتکب ہو گا ؟

سید مودودی" صاحب نے جواب دیا ہے کہ یہ صورت تو صریحاً" سود کی ہے (سطر نمبر ۲)
مگر وہ صاحب نقد کم قیمت پر اور ادھار زیادہ قیمت پر دینے کو سود نہیں مانتے اور کہتے ہیں کہ
"ترجمان القرآن ماہ جنوری ۱۹۹۲ء صفحہ ۷۱ پر لکھا ہے":
"نقد اور ادھار کی قیمت میں فرق کے ساتھ چیز فروخت کرنا اور خریدنا جائز ہے ۔"
(سطر نمبر ۱۰)

ریڈیو پر میں نے خود سنا جو عالم جواب دے رہے تھے انہوں نے اسے سُود بتایا ۔ میثاق کے پرچہ میں بھی اسے غلط قرار دیا گیا ہے کہ نقد اور ادھار قیمتوں میں فرق ہو اور بحث کی گئی کہ یہ اجتہاد درست نہیں' اس کی کوئی دلیل نہیں ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا ایک رکنِ جماعت کے لیے یہ جائز ہو گا کہ وہ ایسا کرتا رہے' کیا

فقہ میں اس کی گنجائش ہے ؟ ایک رکن کے لیے صحیح طرزِ عمل کیا ہے ؟ اگر وہ اسے سُود نہیں مانتا تو کیا وہ رکن رہ سکتا ہے ؟ اور کیا امیرِ جماعت بھی منتخب ہو سکتا ہے ؟

جواب:

بلا شبہ مولانا مودودی رحمہ اللہ نے رسائل و مسائل حصہ اوّل میں یہ لکھا ہے کہ نقد اور ادھار کی قیمت میں فرق سود ہے' مگر یہ مرحوم کی ذاتی رائے ہے اور انہوں نے جماعت کے افراد کو اپنی فقہی آراء کا پابند نہیں کیا۔ امّت کی اکثریت کا مسلک یہ ہے کہ ادھار اور نقد کی قیمت میں تفاوت جائز ہے اور یہ سود کی تعریف میں نہیں آتا۔ مولانا عبد المالک صاحب نے ترجمان جنوری ۱۹۹۲ء میں جواب اسی کے مطابق دیا ہے اور میں ہمیشہ یہی جواب مولانا مودودیؒ کے حینِ حیات بھی دیتا رہا ہوں جس کا انہیں علم تھا اور انہوں نے اس سے اختلاف نہیں فرمایا' نہ مجھے ایسا جواب دینے سے روکا اور میں نے اس مسئلے پر جو تھوڑا بہت مطالعہ کیا اس سے اندازہ ہوا کہ صرف امام ابن حزم یا اصحابِ سلف میں سے ایک آدھ دیگر بزرگ نے اکثریت سے اختلاف کیا ہے ورنہ علماء جمہور جواز کے حق میں ہیں اور اکثریت کے قول کی تغلیط و تردید آسان نہیں ہے۔

حنفی فقہ کی کتابوں میں یہ مسئلہ بالعموم مذکور ہے کہ نقد اور ادھار قیمتوں میں تفاوت جائز ہے۔

فتاویٰ دار العلوم دیو بند' جلد اوّل دار الاشاعت کراچی ص ۶۳۴ ' ص ۶۳۵ پر چار سوال اس مضمون کے موجود ہیں جن کا جواب شامی ' ھدایہ وغیرہ کے حوالے سے یہی دیا گیا ہے کہ ادھار کی وجہ سے قیمت زیادہ کرنا جائز ہے۔ ایک جواب کے الفاظ ہیں "اجل کی وجہ سے زیادہ ثمن معروف ہے کماقی الشامی" دوسرے جواب میں الفاظ ہیں "یہ جائز ہے" ۔ سنن ترمذی کتاب البیوع میں حضرت ابوھریرہؓ سے مروی ہے : **نہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن بیعتین فی بیعتہ** (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سودے میں دو سودوں کو جمع کرنے سے منع فرمایا ہے)امام ترمذی اس پر فرماتے ہیں کہ بعض اہل علم نے اس کی تفسیر یہ بیان فرمائی ہے **ان یقول ابیعک ھذا الثوب بنقد بعشرہ وبنسیۃ بعشرین ولا یفارقہ علی احد البیعتین** (بیچنے والا خریدار سے یہ کہے کہ میں یہ کپڑا تمہارے ہاتھ نقد دس میں اور ادھار بیس میں فروخت کرتا ہوں اور دونوں صورتوں میں کسی ایک پر بات کو ختم اور منقطع نہ کرے) **فاذا فارقہ علی احدھما فلا باس اذا کانت العقدہ علی احد منھما** (اگر دونوں صورتوں میں سے ایک پر بات طے ہو جائے تو پھر کوئی مضائقہ نہیں)۔

مولانا سید نذیر حسین محدث دہلوی نے فتاویٰ نذیریہ ' جلد دوم "کتاب البیوع ص ۱۴۳-۱۴۲ پر متعدد سوالات کے جوابات میں نقد اور ادھار کی قیمت میں فرق کو جائز قرار دیا ہے۔ایک جواب کی عبارت درج ذیل ہے:

"اگر بائع نقد کی صورت یا ادھار کی صورت کو متعین کر کے فروخت کرے تو بیع حلال و جائز ہے ' یعنی بائع بیچنے کے وقت خریدار سے کہے کہ میں تیرے ہاتھ اس غلہ کو نقد فی روپیہ پچیس سیر فروخت کرتا ہوں یا یوں کہے کہ اس غلہ کو ادھار فی روپیہ بیس سیر فروخت کرتا ہوں ' تو یہ بیع جائز و درست ہے لعموم الا دلتہ القاضیہ بجوازہ (کیوں کہ اس کے جواز کے لیے عمومی قطعی دلائل موجود ہیں) اور اگر نقد کی صورت یا ادھار کی صورت کو خاص اور متعین کر کے فروخت نہ کرے ' تو یہ بیع حرام و ناجائز ہے ' یعنی فروخت کے وقت یوں کہے کہ اس غلہ کو تیرے ہاتھ نقد پچیس سیرفی روپیہ اور ادھار فی روپیہ بیس سیر فروخت کرتا ہوں اور نقد کی صورت یا ادھار کی صورت کو خاص و متعین نہ کرے تو اس طرح کی بیع ناجائز ہے ۔"

میں سمجھتا ہوں کہ اگر خریدار کے لیے یہ اختیار موجود ہے کہ وہ چاہے تو مال نقد خرید لے اور چاہے تو ادھار خرید لے اور قیمت بعد میں ادا کرے تو اس اختیار کے بعد اگر مشتری زائد قیمت پر مال خریدنا پسند کرے تو خرید و فروخت کی یہ صورت جائز ہو گی اور ایک مسلمان اس پر عمل کر سکتا ہے۔

مطبوعات

پاسدارانِ دعوت و عزیمت: از جناب منیر خلیلی صاحب ۔ حسن البناء اکیڈمی ' راولپنڈی ۔ ناشر ' دارالکتب ' گارڈن کالج روڈ ' راولپنڈی۔متوسط کتابت و طباعت ۔ صفحات ۱۹۶ ۔قیمت درج نہیں ۔

یہ دور جب کہ ملکوں ملکوں میں دعوتِ اسلام اور تجدید و احیائے اسلام کی مساعی عمل میں آ رہی ہیں ' کہیں تیز تیز اور زور دار ' کہیں آہستہ آہستہ اور نرم خیز۔۔۔ پھر ایسی مساعی کے مر تکبین کو طاغوت زدہ یا ناقہم حکومتیں استبداد کی چکی میں پیستی ہیں اور ان کو ترغیب و تحسین خداوندانِ باطل کی طرف سے ملتی ہے ۔ لیکن کچلے پسے ہوئے خدا پرستوں میں پھر سے نئی قوت ابھر آتی ہے اور وہ پھر دعوتِ حق کا علم بلند کر دیتے ہیں ۔اس طرح تاریخ کے سمندر میں جب اسلامی دعوتِ انقلاب کی لہریں بلند ہوتی ہیں تو جو ہستیاں ان کو اٹھانے اور سربلند رکھنے والی ہوتی ہیں ' غالباً" منیر خلیلی صاحب کی نگاہ جوہر شناس ایسی ہی شخصیتوں پر مرتکز ہوئی ہے' اور انہوں نے ایمانی شعور اور والہانہ جذبات کے ساتھ ان کی ایسی تصویر کشی کی ہے کہ دیکھنے والوں کی نگاہیں جذب ہو کر رہ جاتی ہیں ۔ منیر صاحب نے پاسدارانِ دعوت و عزیمت کے احوال و مقامات پیش کرتے ہوئے اپنی نازک ذمہ داری کو یوں محسوس کیا ہے " ہم پل صراط عبور کر رہے ہیں "۔

منیر صاحب نے اس دورِ افتراق کی پیدا کردہ گروہ بندیوں سے بالا تر ہو کر عالمِ اسلام میں جہاں کہیں اسلام کی مہر منیر کی روشنی کے چشمے اُبلتے دیکھے ' وہیں نگاہیں جما دیں ۔ جن بڑے آدمیوں یا رجالِ عظیم کا ذکر اس کتاب میں ہے ان کی شخصیتوں کی بڑائی کا فیصلہ اس معیار سے کیا گیا ہے کہ "کسی شخصیت پر قرآن کا کتنا رنگ ہے اور وہ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا اپنے اندر کتنا عکس رکھتی ہے "۔

کتاب میں باب اوّل شیخ احمد یاسین (تحریک الانتفاضہ فلسطین) کے بیان سے کیا گیا ہے۔ اپنی

سرسری تاثراتی واقفیت کے مقابلے میں جب شیخ کے تفصیلی احوال کو پڑھا تو حیران رہ گیا کہ اس شخصیت نے کیسے کیسے کارنامے انجام دیے ' خصوصاً" ایک حادثہ میں گردن کے مہرے ٹوٹ جانے کے بعد جب وہ لحم و استخوان کا بہت ہی معذور ڈھانچہ بن کر رہ گئے تو نہ جانے کیسے ایمانی جذبے سے وہ تحریک انتفاضہ کے سربراہ بلکہ روح رواں بن گئے اور اسرائیل اور مغرب کے لیے باعثِ صد پریشانی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کا بھی انہیں بطورِ خاص مرجع بنا دیا۔ اس دوران میں انہوں نے کئی کئی ہجرتیں کیں اور جیل میں بھی رہے ۔ مگر جسمانی طور پر شدید معذور ہستی کے ایمانی جہاد میں کوئی فرق نہ آیا ۔ اور داد دیجئے اس عظیم خاتون حلیمہ حسن یاسین کو جس نے شیخ کی ساری معذوریوں کے ساتھ اپنی زندگی مناکحت کے لیے پیش کر دی اور پھر ان کو کرسی پر اِدھر اُدھر لے جانے کے علاوہ ان کی صفائی ستھرائی اور تمام ضروریات و مسائل کی ذمہ داری لی ۔ ہزار مغرب پرست ماڈرن لڑکیاں اور بیگمات اس کے پاؤں کی جوتی پر نثار!

پھر مصر کے حافظ سلالہ کا تذکرہ پڑھا تو اس نے اور بھی ورطۂ حیرت میں ڈال دیا ۔

حافظ سلالہ یہودیوں کے خلاف ۱۹۴۹ء کی جنگ میں شریک ہوئے ۔ پھر معرکہ نہر سویز ۱۹۵۶ء میں محاذ آرا ہوئے ۔ ۱۹۷۳ء میں جب سویس شہر کو مصری فوجی کمانڈر نے لاؤڈ اسپیکروں سے خالی کرنے کا اعلان کر دیا تو حافظ سلالہ نے جوابی اعلان یہ کیا کہ سویس خالی نہیں کیا جائے گا اور ہم جیتے جی دشمن کو قابض نہیں ہونے دیں گے ' بلکہ بچہ بچہ گلی گلی میں لڑے گا ' اسرائیلیوں کو سنا دیا گیا کہ سویس کا محاذ قائم ہے ۔ اس اعلان پر شہر کے تمام لوگ تیار ہو کر سڑکوں پر آ گئے۔ فوج نے یہ منظر دیکھا تو وہ بھی پلٹ آئی ۔ چنانچہ اسرائیلی فوج پیچھے ہٹ گئی ۔ حافظ سلالہ کو "دیوانہ بوڑھا" اور "بوڑھا شیر" کہا جانے لگا۔ اخوان کے خلاف ناصر کے فرعونی ظلم کے بعد حافظ سلالہ نے از سرِ نو تحریکِ نفاذِ شریعت کے لیے تنظیم کھڑی کر لی ۔ سادات کے بعد (جسے حافظ سلالہ ہی نے ختم کیا تھا)۱۹۸۱ء میں جب حسنی مبارک اپنے پیشرو کی خون آلود گدی پر بیٹھا تو اسے اندازہ ہو گیا کہ اخوان نے جو تحریک اٹھائی تھی ' وہ دوسرے روپ میں ابھر آئی ہے ۔ پھر قید و بند اور حکومت سے آویزش کی آزمائش شروع ہو گئی۔ لیکن حافظ سلالہ کا کام جاری رہا۔

پھر اہم تذکرہ ترکی کے صالح اوزجان کا ہے ۔

جدید ترکوں کے الغائے خلافت نیز اسلامی عبادات اور اقدار و آثار کو مٹانے اور اسلامیت کے بجائے مغربی سیکولرازم اور دین و ریاست کا انقطاع ' اور معاشرت و تعلیم میں مغرب کی تقلیدِ مُطلق نے وہ پس منظر مہیا کیا جس نے اندر ہی اندر بیشمار لوگوں پر اثر ڈالا ہو گا ' اسی نے صالح

اوزجان کے سینے میں ایمان کو بیدار کیا۔ مصر میں تعلیمی دور گزارنے کے بعد شیخ بدیع الزمان نورسی کی نوری تحریک سے تعلق پیدا کر لیا۔ زیرِ زمین کام کرتے کرتے صالح اوزجان کے حلقے کا اثر عدنان مندریس' اور وزیر اوقاف تک جا پہنچا۔ اس نوجوان نے علامہ نورسی کے عربی لٹریچر کا ترکی میں ترجمہ کیا 'مولینا مودودیؒ کے رسالہ شہادتِ حق کا ترجمہ بھی کیا۔ حسن البنا' سید قطب اور عبدالقادر عودہ کے افکار کو پھیلایا۔ آخر اسلام کی آواز پارلیمنٹ میں جا پہنچی۔ اسلامی اداروں اور اقدار و شعائر پر عائد پابندیوں کو ہٹانے کا آغاز ہوا۔ باقی تفصیل کتاب میں ملاحظہ فرمائیں۔ یہ چند مثالیں دینے کے بعد قارئین سے درخواست ہے کہ صبری قوتشی (البانیہ) شیخ عبد اللہ عزام شہید (فلسطین) عیسیٰ یوسف البتگین (مشرقی پاکستان) پروفیسر غلام اعظم (بنگلہ دیش) اور شیخ محمد الغزالی (مصر) کے حالات کتاب میں ملاحظہ فرمائیں' کیونکہ تمام شخصیتوں کے اجمالی تعارف کے لیے بھی خاصی جگہ چاہیے۔

مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ منیر خلیلی صاحب نے بہت اچھی' سادہ اور دل کش زبان میں کتاب لکھی ہے اور یہ کہیں محسوس نہیں ہوتا کہ مصنوعیت سے کام لیا گیا ہے۔ (ن ۔ ص)

آئینہ پرویزیت: تصنیف مولینا عبد الرحمن کیلانی ۔ ناشر مکتبہ السلام ۔ وسن پورہ گلی نمبر ۲۰' لاہور ۔ ہلکے کاغذ پر باریک کتابت' ہر حصہ سو' سوا سو صفحے کا۔

انتہائی مختصر اظہار رائے کرتا ہوں کہ دور معتزلہ سے لے کر طلوعِ اسلام تک (دوسری صدی ہجری تا ۱۳-۱۴۱۲ھ) مختلف طرز کے منکرینِ حدیث کے مکاتب کے احوال پیش کیے ہیں۔ نوعیتِ مباحث علمی ہے اور حوالوں اور اقتباسات کے ساتھ کلام کیا گیا ہے۔ یہ کوشش اپنے موضوع پر جامع ہے اور اس سے استفادہ اس لیے اشد ضروری ہے کہ ملحدوں' فطرت پرستوں' انحراف پسندوں اور بے حدود و قیود زندگی بسر کرنے کے شائقین جن میں اغیار پرست اور سیکولر نظریات کے فدائی شامل ہیں' ان سب نے اسلام کا کھلا کھلا انکار کرنے کی بجائے احادیث (یا سنت) سے انکار کر کے گویا قرآن کے متعین عملی مفاہیم کو بدل ڈالنا اور آیات و الفاظ کو من مانے معنی پہنانا' اور مختلف احکام کو قرونِ اولیٰ کے ساتھ وابستہ قرار دے کر بگشٹ قسم کی اجتہادیت (ضمناً" تقلیدِ اغیار کی آزادی) کا راستہ اختیار کیا۔ فتنۂ انکارِ حدیث جس کے اس دور میں معلم مستشرقین ہیں' ہمارے دانشور طبقوں پر بھوت پریت کے سایہ کی طرح آباد ہوا۔ اس کے اثرات سیاست اور معاشرے پر پڑ رہے ہیں۔ ایسے حالات میں کیلانی صاحب کی یہ محنت بہت مفید ہے۔

(ن ۔ ص)

REGD. NO. L 5340

PHONE : 234014
236665

MONTHLY **TARJUMAN-UL-QURAN** LAHORE